Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 17. Issue 01, June 2025

تحقیقی وتنقیدی مجلّہ
دریافت

Received: 18th Feb, 2025 | Accepted: 11th June, 2025 | Available Online: 30th June, 2025
Digital Object Identifier:

ناصر عباس نیر کے افسانوں کی تحلیل: بیانیہ، فکر اور موضوعاتی جہات

An Analysis of Nasir Abbas Nayyar's Short Stories: Narrative, Thought, and Thematic Dimensions

MUNIR ABBAS[1] AND DR. MUNAWAR AMIN[2]
[1] PhD Research Scholar, Department of Urdu, Minhaj University, Lahore, Pakistan.
[2] Assistant Professor, Department of Urdu, University of Southern Punjab, Multan, Pakistan.
Corresponding author: Munir Abbas (munirsipra9810@gmail.com)

ABSTRACT Dr. Nasir Abbas Nayyar is a distinguished Urdu fiction writer and critic whose stories delve into profound intellectual and theoretical discussions. His writings are not merely confined to storytelling but compel the reader to think critically. His literary mastery and Thought, Narrative and Thematic Dimensions are vividly reflected in all five books of his short story collections. His fiction encompasses diverse themes such as oppression, violence, politics, sociology, culture, colonialism, postcolonialism, existentialism, class division and psychological conflicts. He skillfully incorporates Punjab's folk wisdom, language, and expressions into his stories, creating a deep sense of familiarity and harmony for the reader. His writings highlight the significance of language and the power of narrative while establishing an intellectual resistance against authoritarian and colonial discourses. Nasir Abbas Nayyar's fiction reflects social and cultural issues, addressing themes like identity crisis, loneliness, and emotional turmoil. His works employ intertextuality, symbolism, metaphors, and abstract language, offering a unique creative experience. His stories blend aesthetic beauty with intellectual depth, not only engaging the reader but also prompting reflection on life's complex questions. Thus, Nasir Abbas Nayyar's fiction stands as an exemplary fusion of intellectual stimulation and creative expression in Urdu literature.

Keywords Narrative, Thematic Dimensions, Colonialism, Postcolonialism, Culture.

ڈاکٹر ناصر عباس نیر اردو ادب کے ممتاز اور معتبر ادیبوں میں شمار ہوتے ہیں۔ وہ نہ صرف ایک ممتاز افسانہ نگار ہیں بلکہ ادبی تھیوری کے عملی اور نظری مباحث میں بھی ایک مستند مقام رکھتے ہیں۔ وہ اردو میں مابعد نو آبادیاتی مطالعات کے بنیاد گزاروں میں شامل ہیں۔ ان کی تنقیدی کتب میں "مابعد نو آبادیات: اردو کے تناظر میں"، "اردو ادب کی تشکیل جدید"(ایوارڈ یافتہ)، "ثقافتی شناخت اور استعماری اجارہ داری"، "جدید اور مابعد جدید تنقید، لسانیات اور تنقید"، " متن: سیاق اور تناظر"، "مجید امجد: حیات، شعریات اور جمالیات"، "اردو ادب کی تشکیل جدید، (دو مرتبہ ایوارڈ یافتہ)"، "اُس کو اک شخص سمجھنا تو مناسب ہی نہیں"، "نظم کیسے پڑھیں"، "جدیدیت اور نو آبادیات"، "اور نئے نقاد کے نام خطوط" اور دیگر شامل ہیں۔ ان کی تحریروں کا امتیاز یہ ہے کہ وہ معنی کو محدود

***This work** is licensed under a* **Creative Commons Attribution-NonCommercial 4.0 International License (CC BY-NC 4.0)**

اور جامد تصور کرنے کے بجائے اسے وسعت اور تنوع کے ساتھ حقیقت سے قریب تر مانتے ہیں۔ روایتی آفاقیت اور مروجہ اصولوں کو چیلنج کرتے ہوئے، ان کے بیانیے مہابیانیوں کے سخت تصورات کے بر خلاف نئی فکری راہیں پیش کرتے ہیں۔ ان کی ادبی مہارت اور موضوعاتی و فکری گہرائی ان کے پانچوں افسانوں کے مجموعوں میں بخوبی جھلکتی ہے۔ ان کا پہلا مجموعہ "خاک کی مہک" (۲۰۱۶ء) اپنی تازگی اور فکر انگیزی کی وجہ سے ادبی حلقوں میں نمایاں ہوا۔ اس کے بعد دوسرا مجموعہ "فرشتہ نہیں آیا" (۲۰۱۷ء) ان کے فنی کمالات کا ایک اور اہم سنگ میل ثابت ہوا۔ تیسرا مجموعہ "ایک زمانہ ختم ہوا ہے" (۲۰۲۰ء) ان کے تخلیقی سفر کی تسلسل کے ساتھ گواہی دیتا ہے، جبکہ "راکھ سے لکھی گئی کتاب" (۲۰۲۳ء) نے اردو افسانے کو ایک منفرد جہت عطا کی۔ ان کا پانچواں اور حالیہ مجموعہ "جب تک ہے زمین" (۲۰۲۵ء) ان کی فکری اور فنی معراج کا مظہر ہے۔

ڈاکٹر ناصر عباس نیر کی یہ تخلیقات اردو ادب میں نہ صرف نئی راہیں متعارف کراتی ہیں بلکہ قارئین کو ایک وسیع اور گہری فکری کائنات میں لے جاتی ہیں۔ جہاں پرانی روایات کو نئے معانی میں ڈھال کر ایک جدید بیانیہ تشکیل دیا جاتا ہے۔ ناصر عباس نیر کے افسانے اپنی فکری گہرائی اور موضوعاتی وسعت کی وجہ سے اردو ادب میں منفرد مقام رکھتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں خاص بات یہ ہے کہ وہ قاری کو محض کہانی سنانے تک محدود نہیں رکھتے، بلکہ اسے غور و فکر کرنے پر اکساتے ہیں۔ ان کے ہاں موضوعات کا ایک ایسا تنوع موجود ہے جو انسانی زندگی کے کئی پہلوؤں کو محیط کرتا ہے۔ ان کے ایک ہی افسانے میں مختلف بیانیے، کئی موضوعات اور افکار پھوٹ رہے ہوتے ہیں۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں جبر، تشدد، ناانصافی، طاقت، منافقت، سیاست، ریاست، سماجیات، فطرت، ثقافت، مقامیت، عالمگیریت، وجودیت، نوآبادیات، مابعد نوآبادیات، مابعد جدیدیت، استعماریت، رد استعماریت، ناسٹلجیا، استحصالی ماحول، سرمایہ داری نظام، طبقاتی تقسیم، دیہاتی و شہری کلچر، اور نفسیاتی و جنسی الجھنوں جیسے موضوعات کو فکر انگیز انداز میں پیش کیا ہے۔

ڈاکٹر ناصر عباس نیر کے افسانے محض ایک کہانی بیان کرنے کا عمل نہیں ہیں بلکہ یہ واہموں، خوابوں، لایعنیت، حکایتوں اور داستانوی طرزِ بیان کا امتزاج ہیں۔ ان کے افسانوی بیانیے کی ساخت میں بارہا ایسا ہوتا ہے کہ بیان کنندہ کہانی بیان کرتے ہوئے کسی ضمنی خیال یا غیر متوقع موضوعات کی طرف مڑ جاتا ہے۔ کبھی وہ کسی خواب، کسی نئے خیال، نئی فکر، کسی قدیم روایت، کسی حکایت یا کسی اجنبی زمان و مکان کے قصے کا حوالہ دے کر کہانی کو ایک نئی سمت عطا کرتا ہے۔ یہ انداز قاری کو زمان و مکان کی محدودیت سے نکال کر معنویت کے ایک ایسے جہان میں لے جاتا ہے جہاں کہانی کا مقصد ایک جامد حقیقت کی وضاحت نہیں بلکہ متعدد امکانات کی کھوج بن جاتا ہے۔ ان کے افسانوں کا ایک خاصہ یہ ہے کہ ان کے کئی جملے ایک مکمل مضمون کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ وہ جملہ نہ صرف قاری کے سامنے ایک نئی فکر پیش کرتا ہے بلکہ اگلے جملے میں ایک اور منفرد زاویہ ابھرتا ہے، جو قاری کو مسلسل متوجہ رکھتا ہے۔ ان کے ایک افسانے میں کئی کئی بیانیے بھی ملتے ہیں۔ جو قاری کو فکری و نظری لحاظ سے سیر اب کر رہے ہوتے ہیں۔

دراصل بیانیہ ایک ایسی ادبی اصطلاح ہے جس کے ذریعے کسی واقعے، تجربے یا خیال کو ترتیب، تسلسل اور راوی کے نقطۂ نظر سے اس انداز میں بیان کیا جاتا ہے کہ وہ قاری کے ذہن میں ایک مکمل اور معنی خیز تصور قائم کر دے۔ بیانیہ صرف کہانی سنانے کا عمل نہیں بلکہ اس میں واقعات کو اس طرح بُنا جاتا ہے کہ ان سے ایک خاص موقف یا خیال ابھرے۔ افسانے میں بیانیہ اس وقت مؤثر بنتا ہے

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 17. Issue 01, June 2025

جب مصنف محض واقعات کی روداد بیان کرنے کے بجائے ان کے پیچھے چھپے ہوئے خیالات، جذبات، تضادات اور معاشرتی حوالوں کو اجاگر کرے، تاکہ قاری نہ صرف واقعات کو سمجھے بلکہ ان سے ایک خاص تاثر یا نظریہ اخذ کرے۔ مثلاً اگر ایک افسانہ طبقاتی ناانصافی پر مبنی ہے، تو واقعات، کرداروں کی زبان، اور راوی کا لہجہ سب مل کر ایسا بیانیہ قائم کرتے ہیں جو قاری کو ناانصافی کے خلاف سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔ یوں افسانہ محض تفریح نہیں رہتا بلکہ ایک فکری بیانیہ بن جاتا ہے جو قاری کی سوچ میں تبدیلی لا سکتا ہے۔

اسی طرح ناصر عباس نیرّ کے افسانے بھی محض کہانی سنانے کا عمل نہیں بلکہ فکری بیانیے کی تخلیق کا ذریعہ ہیں، جن کے ذریعے وہ معاشرتی، سیاسی اور تہذیبی حقیقتوں کو نئے زاویے سے قاری کے سامنے رکھتے ہیں۔ انہوں نے بیانیہ کو صرف واقعات کی ترتیب کے طور پر نہیں، بلکہ ایک فکری موقف کے طور پر برتا ہے، جس میں نو آبادیاتی ذہنیت، ثقافتی الجھنیں، شناخت کا بحران، اور طاقت کے نظام جیسے موضوعات کو فنکارانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ ان کے افسانوں میں راوی کا زاویہ دید، علامتوں کا استعمال، اور زبان کا اسلوب، سب کچھ اس بات پر مرکوز ہوتا ہے کہ قاری محض کہانی نہ پڑھے بلکہ اس کے اندر چھپے فکری موقف اور تنقیدی نکتہ نظر کو محسوس کرے۔ یوں ناصر عباس نیرّ کے افسانے بیانیہ کو ایک فکری اور تنقیدی اظہار میں بدل دیتے ہیں، جو قاری کو سوچنے، سوال اٹھانے اور موجودہ نظام پر نظر ثانی کرنے پر آمادہ کرتے ہیں۔

ان کے افسانوی بیانیے میں انسانیت کی حمایت اور ظلم و استحصال کی مخالفت ہمیشہ غالب رہتی ہے۔ ان کے افسانے انفرادی اور اجتماعی سطح پر طاقت کے ناجائز استعمال، ریاستی اداروں کے جبر اور سیاسی و سماجی ناانصافی کی کہانی سناتے ہیں، جو انسان کی آزادی اور وقار کو متاثر کرتے ہیں۔ ریاستی دہشت ان کے افسانوں میں ایک نمایاں عنصر کے طور پر موجود ہے۔ جہاں طاقتور ادارے عام افراد کی زندگیوں کو کنٹرول کرنے اور ان پر دباؤ ڈالنے کے حربے استعمال کرتے ہیں۔ ان کے کردار عموماً ایسے حالات میں دکھائی دیتے ہیں، جہاں ظلم اور ناانصافی ان کی شخصیت اور نفسیاتی حالت پر گہرے اثرات مرتب کرتے ہیں۔ وہ نو آبادیاتی اور نو استعماری قوتوں کے اثرات کو واضح کرتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ ان کے خلاف مزاحمت کا بیانیہ بھی تشکیل دیتے ہیں۔ ان کے ہاں تاریخ اور عصری مسائل کی یہ آمیزش ان کے افسانوں کو نہ صرف فکری اعتبار سے بلند کرتی ہے بلکہ قاری کو موجودہ دور کے مسائل پر بھی غور کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ ایسے ہی موضوع پر ان کا افسانہ "پرانا اور نیا نظام انصاف" ان کے چوتھے مجموعے میں موجود ہے۔ اس افسانے میں نہ صرف انصاف کے نظام کی غیر معقولیت اور طاقت کے بے جا استعمال پر تنقید کی گئی ہے بلکہ انسانی ذہن اور سماجی اصولوں کی تضاد زدہ فطرت کو بھی بے نقاب کیا گیا ہے۔

افسانے کا بنیادی موضوع طاقت اور انصاف کے مابین تضاد ہے۔ افسانے کے کلیدی کردار بادشاہ اور اس کا مشیر اعلیٰ ہیں۔ انہی کے گرد ہی ساری کہانی بُنی گئی ہے۔ یہ دونوں کردار طاقت کی علامت کے طور پر دکھائے گئے ہیں۔ ایک موقع پر بادشاہ کی اکتاہٹ اور مشیر اعلیٰ کی چالاکی یہ ظاہر کرتی ہے کہ کس طرح طاقتور لوگ اپنے ذاتی مسائل کو حل کرنے کے لیے قوانین اور انصاف کے نظام کو اپنی مرضی کے مطابق بدل دیتے ہیں۔ بادشاہ کے فیصلے اور مشیر کی تجاویز انصاف کے نظام کی ناقص بنیادوں کو ظاہر کرتے ہیں۔ جہاں قانون کو انسانیت کی بجائے طاقتور افراد کی خواہشات کی تکمیل کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ مصنف نے انصاف کے نظام میں

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 17. Issue 01, June 2025

تحقیقی وتنقیدی مجلّہ
دریافت

موجودناانصافی اور بے جاتعصب کو خاص طور پر نمایاں کیا ہے۔ جرم کے بجائے نیت کو سزا دینے کا تصور انصاف کے نظام کی غیر حقیقی فطرت کو اجاگر کرتا ہے۔ قاضی اور مشیر کا رویہ یہ واضح کرتا ہے کہ انصاف کا معیار کس حد تک غیر معروضی اور ذاتی خواہشات کے تابع ہو سکتا ہے۔ یہ عدالتی نظام کی اس کمزوری کو عیاں کرتا ہے جو طاقتور افراد کے مفادات کے تابع ہو جاتی ہے۔ رعایا کے رویے میں تبدیلی، جہاں وہ جرم کے بجائے اپنی نیت کو درست ثابت کرنے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ حکومت کی پالیسیوں کے انسانی ذہن پر اثرات کو نمایاں طور پر دکھایا گیا ہے۔

افسانے میں مصنف کا طنزیہ انداز اقتدار اور انصاف کے نظام پر تنقید کو مزید مؤثر بناتا ہے۔ بادشاہ کا اپنی اکتاہٹ کو ختم کرنے کے لیے انصاف کے نظام میں تبدیلی کرنا یہ ظاہر کرتا ہے کہ طاقتور افراد اپنی خواہشات کو پورا کرنے کے لیے عوامی مسائل کو نظر انداز کرتے ہیں۔ مشیر اعلیٰ کا نیا اصول کہ "ہر شخص جرم کی نیت رکھتا ہے" انسانی رویوں اور طاقت کے استعمال پر ایک گہری اور طنزیہ تنقید ہے۔ افسانے کا ایک اہم موضوع نیت اور خواہش کے درمیان فرق بھی ہے۔ مشیر کا اصول کہ "میری خواہش دوسرے کی نیت ہے" یہ ظاہر کرتا ہے کہ کس طرح طاقتور افراد اپنی خواہشات کو جواز بخشنے کے لیے دوسروں پر الزام لگاتے ہیں۔ عدالت میں عورت کے مقدمے کے دوران نیت اور خواہش کے فلسفے پر مباحثہ انسانی رویوں کی پیچیدگیوں کو ظاہر کرتا ہے۔ مصنف نے بادشاہ کے مشیر کی اس بے تکی سوچ کو افسانے میں فلسفیانہ اور فکر انگیز انداز میں یوں پیش کیا ہے۔ مرقوم ہے:

> "مشیر نے پہلی مرتبہ سخت الجھن میں خود کو گھرا ہوا پایا۔ اب تک وہ جرم کی نیت اور خواہش کو ایک ہی چیز سمجھتا آیا تھا۔ اس نے ایک سادہ سا اصول بنایا تھا کہ 'میری خواہش ہی، دوسرے شخص کے یہاں جرم کی نیت ہے۔ چوں کہ میری خواہشیں لامحدود ہیں، اس لیے ہر شخص کے یہاں ہر طرح کے جرم کی نیت بھی موجود ہے۔' وہ خوش تھا کہ ایک سادہ سے اصول نے اسے دنیا بھر کے انسانوں کو سمجھنے کے قابل بنا دیا تھا۔ اس سے اس کے دل میں یہ یقین بھی راسخ ہو گیا تھا کہ ہر شخص پیدائشی مجرم ہے۔"[۱]

افسانہ علامتی انداز میں لکھا گیا ہے، جہاں بادشاہ مطلق اقتدار کی علامت ہے، مشیر اعلیٰ چالاکی اور سیاسی مہارت کی نمائندگی کرتا ہے، اور چرواہا عوام کی معصومیت کی عکاسی کرتا ہے۔ عورت کا کردار ایک آزاد اور بے خوف انسان کی نمائندگی کرتا ہے جو معاشرتی اصولوں کے خلاف سوال اٹھانے کی ہمت رکھتی ہے۔ قاضی انصاف کے نظام کی نمائندگی کرتا ہے، جو طاقتور افراد کی مرضی کے مطابق بدلتا رہتا ہے۔

ناصر عباس نیر کے افسانے "لکھنا بھی سزا ہے اور آدمی ہونا بڑی سزا ہے" میں ایک ایسے جابرانہ معاشرے کی عکاسی کی گئی ہے جہاں ریاست انسان کی آزادی، شعور اور تخلیقی اظہار پر پابندیاں عائد کرتی ہے۔ شہر میں سپاہی جاسوس بن کر ہر فرد کی نگرانی کرتے ہیں، جس سے خوف اور اجنبیت پیدا ہوتی ہے۔ ایک مسافر جب اس شہر میں رہائش کی اجازت حاصل کرتا ہے، تو اس پر بھی وہی سخت شرائط لاگو کی جاتی ہیں۔ افسانے میں علامتوں کا موثر استعمال کیا گیا ہے۔ بدن کی بو فرد کی شناخت کی علامت ہے جو جبر کے باوجود چھپائی

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 17. Issue 01, June 2025

نہیں جا سکتی۔ دیوار سب سے اہم علامت ہے، جس پر روز کچھ لکھنے پر مجبور کیا جاتا ہے، لیکن یہاں لکھنا آزادی نہیں بلکہ سزا ہے۔ ہر لفظ ریاست کے کنٹرول میں ہے اور تخلیق خوف میں جکڑی ہوئی ہے۔ یہ افسانہ ایک ایسے معاشرے کا استعارہ ہے جو ظلم، خوف اور ریاستی جبر کی بنیاد پر فرد کی آزادی سلب کرتا ہے۔

افسانے میں جسمانی اور ذہنی تبدیلیوں کا ذکر بھی ملتا ہے جو جبر کے زیر اثر انسانی حالت کی بگاڑ کو ظاہر کرتا ہے۔ جن میں ان کے دانتوں کا بڑھ جانا، عجیب الخلقت اور جانوروں کی طرح شکل ہو جانا شامل ہے۔ یہ سب سماجی اور ذہنی انحطاط کا استعارہ ہے جو جبر اور خوف کے ماحول میں پروان چڑھتا ہے۔ بادشاہ کی طرف سے قتل کی ممانعت اور اس کے نتیجے میں خودکشیوں کا بڑھ جانا، انسانی جذبات کو دبانے کی کوششوں کے منفی اثرات کو ظاہر کرتا ہے۔ افسانے کا مرکزی کردار جو ایک مسافر ہے اس کے ذریعے فرد کی انفرادی شناخت اور آزادی کے حق کو نمایاں کیا گیا ہے۔ افسانے کے آخر میں اسی مسافر کا اظہار مصنف نے بہت ہی معنی خیز انداز میں پیش کیا ہے:

> "اسے شہر میں قیام کی اجازت اس شرط پر ملی تھی کہ وہ اس دیوار پر کچھ نہ کچھ لکھے گا۔ اس نے پہلے سوچا کہ وہ اندھوں اور گونگوں کے شہروں کا مختصر احوال لکھے گا۔ پھر کچھ سوچ کر اتنا لکھا: لکھنا بھی سزا ہے، پر کسی بادشاہ کے شہر میں آدمی ہونے کی سزا اس سے بڑھ کر ہے۔"(۲)

مسافر کا یہ کہنا کہ 'لکھنا بھی سزا ہے، پر کسی بادشاہ کے شہر میں آدمی ہونے کی سزا اس سے بڑھ کر ہے،' انسانی آزادی کی قدر اور ریاستی جبر کے خلاف احتجاج کی ایک علامتی صدا ہے۔ یہ جملہ انسانی شعور، آزادی اور وجود کے بنیادی سوالات کو اجاگر کرتا ہے۔ مجموعی بات کی جائے تو یہ واضح ہوتا ہے کہ ناصر عباس نیر کے اس افسانہ میں ریاستی جبر، سماجی، سیاسی، انصاف اور نفسیاتی مسائل جیسے موضوعات ہیں۔ طاقت کے ذریعے جبر، آزادی کی اہمیت اور فرد کی تخلیقی صلاحیتوں پر پابندی کے اثرات کو علامتی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ جو قاری کو سوچنے اور سماج کے رویوں پر سوال اٹھانے پر مجبور کرتا ہے۔

ناصر عباس نیر کے افسانے "پروشاسی، کروفر، فروشاسی" میں انسانی شعور، تخلیقی آزادی اور جبر کے باہمی تعلق کو علامتی اور فلسفیانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ افسانے کے کردار پروشاسی، کروفر اور فروشاسی انسان کے اندرونی تخلیقی عناصر اور بیرونی جابرانہ قوتوں کے درمیان جدوجہد کی نمائندگی کرتے ہیں۔ افسانے میں بادشاہ کا کردار اقتدار اور جبر کی علامت ہے، جو ہر چیز کو اپنی مرضی کے مطابق قابو میں رکھنا چاہتا ہے۔ اس کا خوف اقتدار کے نفسیاتی پہلو کو ظاہر کرتا ہے۔ جسارت علی خاں تخلیقی آزادی اور ماضی سے وابستگی کا استعارہ ہے، جو جبر کے خلاف تخلیقی احتجاج کی علامت ہے۔ افسانہ دراصل اس بات کی گہرائی سے وضاحت کرتا ہے کہ تخلیق اور آزادی ہمیشہ طاقتور قوتوں کے خلاف جدوجہد میں مصروف رہتی ہیں۔ اسی بنیادی فکر کو مصنف نے ایک جملے میں پیش کر دیا ہے:

> "جسارت علی خان نے شفاعت اللہ سے کہا کہ ناانصافی، پرانی ہو کر بھی ناانصافی رہتی ہے اور تاریخ کے سینے پر بوجھ کی مانند ہوتی ہے۔"(۳)

ناصر عباس نیر کے افسانوں میں بین المتونیت کا عنصر بہت نمایاں ہے، جو ان کے بیانیے کو مزید معنی خیز اور متنوع بناتا ہے۔ بین المتونیت کے ذریعے وہ مختلف متون، خیالات اور حوالہ جات کو اپنی کہانیوں کا حصہ بناتے ہیں اور انہیں ایک نئی معنویت کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔

بین المتونیت مغرب سے روشناس ہوئی ادبی اصطلاح ہے۔ جس کے بارے کہا جاتا ہے کہ:

"بین المتونیت کی اصطلاح فرانسیسی نظریہ ساز ژولیا کرستیوا نے وضع کی ہے۔ مراد یہ ہے کہ کوئی بھی متن ایسا نہیں (خواہ وہ ناول ہو یا نظم یا تاریخی دستاویز) جسے اپنے آپ میں مکمل اور خود مختار سمجھا جائے۔ ہر متن دوسرے معنوں کے توسط سے وجود میں آتا ہے۔ پڑھنے والا کسی متن کے معنی تک اسی صورت میں پہنچے گا جب وہ پہچان لے کہ زیر نظر متن کا دوسرے متنوں سے کیا تعلق ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ہر متن دوسرے متون (یا اظہار کی طرزوں) کو اپنے میں جذب اور منقلب کرتا رہتا ہے۔ گویا بین المتونیت کا نظریہ یہ دعویٰ رکھتا ہے۔ کسی متن کا از خود وجود نہیں۔ صرف مسلسل تعبیرات اور باز تعبیرات کا عمل اس کے وجود کا ضامن ہے۔ اس طرح متن کی کسی خواندگی کو قطعیت کا حامل نہیں سمجھا جا سکتا۔ ہر خواندگی ایک نئے متن کو سامنے لائے گی اور یہ متن فوراً ہی اس سلسلے کا حصہ بن جائے گا جس کی حدود میں رہ کر متن کی کوئی تشریح ممکن ہے۔"(۴)

بین المتونیت کا یہ تصور ادب، ثقافت، تاریخ، اور زبان کے مختلف پہلوؤں کے ذریعے متون کے درمیان روابط کو سمجھنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ ایک متن کسی دوسرے متن سے متاثر ہو سکتا ہے یا اس میں کسی دوسرے متن کا حوالہ دیا جا سکتا ہے۔ متون کے درمیان یہ تعلق اکثر ادبی گفت و شنید یا مکالمہ کی صورت میں سامنے آتا ہے، جہاں ایک متن دوسرے متن کے خیالات، موضوعات یا طرز کو چیلنج یا جاری رکھتا ہے۔ ایک متن کی معنی سمجھنے کے لیے اس کے دیگر متون کے ساتھ تعلق کو سمجھنا ضروری ہوتا ہے۔ بین المتونیت میں کسی متن کا اقتباس یا تقلید شامل ہو سکتی ہے۔ یہی صورت حال ڈاکٹر ناصر عباس نیر کے اس افسانے کے ساتھ ساتھ دیگر کئی افسانوں میں دیکھی جا سکتی ہے۔ یہ افسانہ ظاہر کرتا ہے کہ تخلیقی عمل ایک مسلسل عمل ہے، جو ماضی، حال، اور مستقبل کو جوڑتا ہے۔ یہ عمل ایک تخلیق کار کی بنیادی ذمہ داری ہے، جو نہ صرف اسے اپنے شعور کا اظہار کرنے کی اجازت دیتی ہے بلکہ اس کی تحریر کو ایک تاریخی استعارہ بھی بنا دیتی ہے۔ افسانے میں پیش کیے گئے فلسفیانہ مباحث، جیسے کہ خیالات کی حفاظت، جبر کے خلاف آزادی کی جدوجہد، اور انسانی شعور کی گہرائی، قاری کو متن کے ساتھ ایک گہری ذہنی وابستگی قائم کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ کہانی نہ صرف ایک تخلیقی احتجاج ہے بلکہ ایک فکری دعوت بھی ہے، جو قاری کو اپنی زندگی کے تجربات اور مشاہدات کی روشنی میں متن کو سمجھنے اور اس کی تشریح کرنے کا موقع فراہم کرتی ہے۔

یہ افسانہ انسانی آزادی، تخلیقی فکر، اور اقتدار کے جبر کے درمیان تعلق پر ایک گہری روشنی ڈالتا ہے۔ ناصر عباس نیر نے اس کہانی کے ذریعے ایک ایسا تخلیقی تجربہ پیش کیا ہے، جو نہ صرف قاری کو محظوظ کرتا ہے بلکہ اسے انسانیت، آزادی، اور تخلیق کے فلسفے پر بھی غور کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ مصنف نے سیاست اور ریاست کے مکروہ چہرے مختلف انداز میں دکھائے ہیں۔ مصنف نے اپنے افسانے "تمہارا قانون" میں بھی ایسی ہی صورت حال کو دکھایا ہے۔ اس افسانے میں ایک سیاسی قیدی کی جدوجہد، مزاحمت اور جبر کے

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 17. Issue 01, June 2025

تحقیقی وتنقیدی مجلّہ
دریافت

سامنے انفرادی و اجتماعی انسانی وقار کی جنگ کو بیان کیا گیا ہے۔ یہ کہانی ریاستی ناانصافی، اقتدار کی زیادتی اور انسان کے اندرونی تضادات کو بھی نمایاں کرتی ہے۔ کہانی کا مرکزی کردار ایک سیاسی قیدی ہے۔ جسے نہ صرف جسمانی بلکہ ذہنی اذیتوں کا سامنا ہے۔ اس کے وجود بھی جاری کشمکش انسان کی آزادی، وقار اور ظلم کے خلاف مزاحمت کی علامت ہے۔ وہ ایک طرف بھوک، بیماری اور اذیت برداشت کرتا ہے، اور دوسری طرف اپنی روح کی طاقت اور اپنے اصولوں پر ڈٹا رہتا ہے۔ وہ ریاستی و حکومتی مشینری کے سامنے ڈٹ کے کھڑا ہوتا ہے۔ ایک بار جیل کے اندر ہی کوئی اعلیٰ افسر ان کو ملنے آتا ہے بلکہ اسے ڈرانے دھمکانے آتا ہے۔ وہ افسر بہت ڈرانے کی باتیں کرتا لیکن وہ نڈر قیدی اس کی کسی بات کا جواب نہیں دیتا اور خاموشی سے صرف سنتا رہتا ہے۔ جب سرکاری افسر نے اسے جان سے مارنے کی دھمکی دی تو تب اس نے اپنی خاموشی توڑی اور اس کو مخاطب ہوا:

> "مصیبت خواہ کتنی بڑی ہو، آدمی سے اس شعور کو چھین نہیں سکتی، ہو سکتا ہے کچھ دیر کے لیے معطل کر دے۔ جو اسے بتاتا ہے کہ مصیبت آئی کہاں سے؟ یہ وہ سچ ہے جس سے تم ڈرتے ہو۔۔۔اس کی آواز کچھ لمحوں کے لیے لرزی، پھر وہ اعتماد سے بولنے لگا۔ اگر تم میری موت کا فیصلہ کر کے آئے ہو تو پھر اس صورت حال سے، جس میں تمھارے بڑوں نے مجھے اور تمھیں مبتلا کیا ہے۔ نکل کر پل بھر کے لیے سوچو کہ کیا موت کے کنارے پر کھڑے شخص سے بات کرنے کا یہی ایک طریقہ ہے؟ اگر تم واقعی موت جیسی چیز سے آزاد ہوتے تو پھر تم مجھ سے ہر بات کہنے کا اختیار رکھتے۔"(۵)

ناصر عباس نیر کے اس افسانے میں ایک سیاسی قیدی کی مزاحمت کے ذریعے ظلم، جبر، اور طاقت کے نظام پر گہری تنقید کی گئی ہے۔ قیدی کو توڑنے کے لیے جیل کا ہر کارندہ 'سنتری سے اعلیٰ افسر تک' طاقت کے مختلف روپ دھار کر سامنے آتا ہے، مگر قیدی اپنے اصولوں پر ثابت قدم رہتا ہے۔

جیل کی کوٹھڑی اور افسر کا دفتر طاقت اور عوام کے درمیان تفاوت کو ظاہر کرتے ہیں، جبکہ قیدی کا کہنا "دیس کے سب بچے ہمارے ہیں" اس کے اجتماعی شعور اور انسانیت سے وابستگی کی علامت ہے۔ قیدی کی مزاحمت انفرادی عزم سے بڑھ کر اجتماعی جدوجہد کی علامت بن جاتی ہے۔ اگرچہ ریاست اسے قتل کر دیتی ہے، لیکن اس کی قربانی ایک یادگار کے ذریعے زندہ رکھی جاتی ہے، جو خود ریاستی منافقت کا استعارہ بن جاتی ہے۔ افسانہ آزادی، انسانی وقار، مزاحمت اور اصولوں پر قربانی جیسے اہم موضوعات کا احاطہ کرتا ہے، اور یہ پیغام دیتا ہے کہ ظلم کے خلاف ڈٹے رہنا ہی اصل آزادی کی راہ ہے۔

ناصر عباس نیر کا افسانہ "غارت گر" ظلم، جبر اور وقت کی بے رحمی کے خلاف فن کی مزاحمت کا استعارہ ہے۔ افسانے میں انسان کی خواہشات، خواب اور احساسات کو وقت کے جبر کے حوالے کیا گیا ہے، تاہم فن کو ایسی قوت کے طور پر پیش کیا گیا ہے جو ان تباہ کن قوتوں سے ماورا ہے۔ مصنف ثابت کرتے ہیں کہ تخلیقی فن تخلیق کار کی ذات کی گہرائیوں سے جنم لیتا ہے، جہاں وقت یا جبر کی رسائی ممکن نہیں۔ یہی فن استعماری اور استبدادی قوتوں کے خلاف ایک فکری مزاحمت بن جاتا ہے، ذہن کو آزاد کرتا ہے اور نئی فکری راہیں

کھولتا ہے۔ یہ افسانہ ان طاقتور طبقات کی نفسیات کو بھی بے نقاب کرتا ہے جو اختیار کھونے کے خوف میں انسانی خیالات تک کو قابو میں رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ طاقتیں تعلیم اور ثقافت جیسے نظاموں کو استعمال کر کے جبر کو دوام بخشتی ہیں۔ افسانہ "غارت گر" میں ناصر عباس نیر فن کی قوت کو ظلم کے خلاف ایک مستقل مزاحمت کے طور پر پیش کرتے ہیں، جو ان کے بیانیے کو فکری گہرائی، معنویت اور انفرادیت عطا کرتا ہے۔

ناصر عباس نیر کے افسانے "شر پسند" میں معاشرتی جمود، ذہنی غلامی اور جبر پر گہری تنقید کی گئی ہے۔ افسانہ عوام کی اندھی تقلید اور حکمران طبقے کے ظلم کو بے نقاب کرتا ہے، جہاں طاقتور طبقہ خوف کے ذریعے عوام کو قابو میں رکھتا ہے، اور عوام اپنی غلامی کو قبول کر کے اس کا دفاع بھی کرتے ہیں۔ بادشاہ، ظلم کا نمائندہ ہے اور اس کے مشیر خوف پھیلانے کے ماہر۔ کہانی میں مزاحمت کرنے والوں کو دبا دیا جاتا ہے اور جھوٹے بیانیے عوام کو حقیقت سے دور رکھتے ہیں۔ "شر پسند" معاشرتی شعور بیدار کرنے والا افسانہ ہے جو ظلم کے خلاف مزاحمت کی ضرورت پر زور دیتا ہے۔ اسی فکر کا تسلسل افسانہ "گڑ اور گولیاں" ہے، جو جدید ریاستی و سماجی جبر کو علامتی انداز میں پیش کرتا ہے۔ افسانہ گڑ خریدنے کے ایک سادہ واقعے سے شروع ہو کر گہرے سیاسی اور اخلاقی سوالات اٹھاتا ہے۔ یہ افسانہ دکھاتا ہے کہ جدید معاشرہ صرف اشیا نہیں، بلکہ اقدار کو بھی مارکیٹ میں تولتا ہے، اور انسان کی آزادی بتدریج محدود ہوتی جارہی ہے۔

افسانے کا دوسرا حصہ ایک نئے زاویے کو جنم دیتا ہے۔ ایک پرسکون منظر اچانک تشدد اور جبر کی بھینٹ چڑھ جاتا ہے۔ راوی کے سامنے والی بال کھیلنے والے نوجوانوں پر فوجیوں کی فائرنگ کا واقعہ، ایک جابرانہ ریاستی نظام کی علامت بن جاتا ہے۔ یہاں، والی بال کھیلتا نوجوانوں کی معصومیت اور زندگی کے آزادانہ پہلو کو ظاہر کرتا ہے، جبکہ ان پر چلائی گئی گولی جدید ریاستی نظام کے جبر اور انسانی آزادی کو دبانے کی نمائندگی کرتی ہے۔ اس صورت حال کی راوی (متکلم) کی زبانی ناصر عباس نے یوں منظر کشی کی ہے:

> "بس ایک لمحے میں کیا دیکھتا ہوں کہ سڑک کے پار، ایک میدان میں کچھ نوجوان والی بال کھیل رہے ہیں۔ اس سڑک سے ایک فوجی ان پر سیدھی گولی چلاتا ہے، والی بال کھیلنے والا ایک نوجوان تڑپ کر گرتا ہے۔ کچھ نوجوان بھاگ جاتے ہیں اور کچھ اس نوجوان کو سنبھالنے لگتے ہیں۔ گولی چلانے والا فوجی اس طرح سڑک پر تیز چل رہا ہے، جیسے بچے اور نوجوان پہیوں والے جوتوں (سکیٹنگ شوز) پر چلتے ہیں۔ اس نے اسی طرح بھاگتے ہوئے گولی چلائی تھی مگر اس کا نشانہ خطا نہیں گیا تھا۔۔۔۔ میں اب گاڑی کو بھول چکا ہوں اور اپنے بچاؤ کے لیے فکر مند سڑک کی الٹی طرف بھاگ رہا ہوں۔"(۶)

افسانے کا یہ حصہ قارئین کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتا ہے، جہاں معمولی واقعات میں چھپا ہوا تشدد اور ظلم سامنے آتا ہے۔ فوجی جوانوں کا بھاگتے ہوئے نوجوانوں کو گولیوں کا نشانہ بنانا ایک ایسی ریاستی مشینری کی نمائندگی کرتا ہے جو طاقت کی وجہ سے غیر انسانی اور بے حس ہو چکی ہے۔ اس کے علاوہ، فوجی وردیوں کا ذکر اور ان کے غائب ہونے کا منظر، ریاستی جبر کی غیر مرئی طاقت کو ظاہر کرتا ہے جو کہانی کے عمومی تناظر کو ایک گہرے سیاسی اور اخلاقی سوال میں تبدیل کرتا ہے۔

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 17. Issue 01, June 2025

مجموعی بات کی جائے تو افسانہ ''گڑ اور گولیاں'' میں ناصر عباس نیر نے ایک منفرد انداز میں جدید سماج کے جبر، ظلم اور بے حسی کو موضوع بنایا ہے۔ افسانہ میں نہ صرف ریاستی تشدد اور جبر پر تنقید کی گئی ہے بلکہ قارئین کو اس نظام پر جو معصوم انسانی زندگیاں تباہ کر رہا ہے، اس پر سوال اٹھانے کی ترغیب بھی ملتی ہے۔ ناصر عباس نیر کے افسانہ ''ستر سال اور غار'' میں سیاسی و ریاستی ظلم و جبر کو ایک گاؤں کی علامت کے ذریعے پیش کیا گیا ہے۔ کہانی میں گاؤں میں قتل و غارت کے واقعات اور ان کے پیچھے چھپی طاقتوں کا راز کھولا گیا ہے۔ گاؤں کے لوگ خوفزدہ اور بے یقینی میں مبتلا ہیں، اور ظاہری زندگی گزار رہے ہیں، جبکہ اصل مسئلے سے لاعلم ہیں۔ ایک متقی شخص اسحاق کو حل کے لیے بلایا جاتا ہے، جو غار میں ستر سال مقیم ایک رازدار شخصیت کی موجودگی کا انکشاف کرتا ہے۔ تاہم، جب گاؤں والے غار جاتے ہیں تو اسحاق خود قتل ہو چکا ہوتا ہے، جس کے بعد گاؤں میں امن قائم ہو جاتا ہے۔ کہانی اس بات پر سوال اٹھاتی ہے کہ آیا اسحاق قاتل تھا یا نظام کا آلہ کار؟ یہ افسانہ ظلم، منافقت، اور خوف کے نظام کی علامت ہے، جہاں اسحاق ظاہری نیکی کے پردے میں سماجی بدامنی کا باعث بنتا ہے۔ اسحاق کی موت کے بعد امن بھی ممکنہ طور پر دھوکہ ہے، کیونکہ نظام کے جڑیں باقی رہتی ہیں۔ مصنف نے قاری کو فکر کرنے پر مجبور کیا ہے کہ آیا اسحاق خود قاتل تھا یا نظام کا شکار، اور یہ کہانی سماجی و سیاسی نظام کی پیچیدگیوں کا آئینہ ہے۔

ناصر عباس نیر کے اس افسانے میں دیہی رنگ اور مقامی و ثقافتی عناصر بھی پائے جاتے ہیں کیونکہ اس کہانی کو گاؤں کے پس منظر کے لحاظ سے بُنا گیا ہے۔ مصنف کا ایسا ہی ایک اور افسانہ ''عورت کو زیادہ محبت کس سے ہے؟'' ہے۔ اس افسانے میں دیہی کلچر کے ساتھ ساتھ انسانی جذبات، سماجی رویوں اور انصاف کے پیچیدہ تصورات کو نہایت گہرائی اور فنکاری کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ کہانی میں دیہاتی زندگی، قدیمی روایات، انسانی جذبات، عورت کے مقام، سماجی عدل اور جدیدیت کے درمیان تصادم کو اجاگر کیا گیا ہے۔ افسانے میں دو کہانیاں بیان کی گئی ہیں۔ پہلی کہانی ایک ایسے سانحے کے گرد گھومتی ہے جہاں ایک بیٹا اپنے باپ کو قتل کر دیتا ہے۔ یہ معاملہ گاؤں کے روایتی عدالتی نظام (پریہنہ) کے سامنے پیش ہوتا ہے۔ مقدمے میں باپ مقتول، بیٹا قاتل اور ماں مدعی ہوتی ہے۔ پریہنہ کے بزرگ اس مقدمے میں متفقہ فیصلہ کرنے سے قاصر رہتے ہیں اور ماں کو مشورہ دیتے ہیں کہ وہ اپنے بیٹے کو معاف کر دے، لیکن ماں اپنے شوہر کے قاتل کو معاف کرنے سے انکار کر دیتی ہے اور انصاف کے لیے اپنی جدوجہد جاری رکھتی ہے۔ اس کی آخری سانس تک یہ ضد قائم رہتی ہے کہ بیٹے کو سزا ملنی چاہیے۔ آخرکار ماں کی وفات کے بعد عدالت بیٹے کو رہا کر دیتی ہے۔ یہ کہانی قارئین کے لیے ایک گہرا سوال چھوڑ جاتی ہے کہ محبت اور انصاف کے درمیان کیا انتخاب کیا جائے۔ دوسری کہانی کنیز نامی عورت اور اس کی پانچ سالہ بیٹی کے گرد گھومتی ہے۔ اس بچی کا مقدمہ بھی گاؤں کی پریہنہ میں پیش کیا جاتا ہے۔ جہاں سماجی ناانصافی اور عورت کے وجود پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس پریہنہ کا نقشہ مصنف نے اس طرح پیش کیا:

> "سہ پہر کا وقت، گرمیوں کا موسم، گاؤں کے درمیان درختوں کے ایک مختصر جھنڈ کے سائے میں، چارپائیوں پر دس رکنی پریہنہ بیٹھی ہے۔ سامنے چارپائی پر کنیز اکیلی بیٹھی ہے۔ آس پاس نیم دائرے کی شکل میں بچھی چارپائیوں پر درجنوں جوان اور بزرگ موجود ہیں، جن کو مجلس کی کارروائی صرف سننے کی اجازت ہے۔۔۔ چند دن پہلے ایک چار سالہ بچی کے قتل کا مقدمہ زیر بحث

ہے۔سب لوگ واقعہ سن چکے ہیں۔"(۷)

افسانے میں کنیز کی پیچیدہ زندگی اور اس کی بیٹی کے قتل کے راز کو نہایت مؤثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔کنیز نے چار شادیاں کیں اور اپنی بیٹی کے قاتل کی تلاش میں گاؤں کی روایتی عدالت "پریہنہ" کا سہارا لیا، جہاں سماجی تعصبات نے اسے ہی مجرم ٹھہرانے کی کوشش کی۔ افسانہ عورت کی محبت، سماجی ناانصافی اور انصاف کی جستجو کے اہم موضوعات پر گہرے فکری سوالات اٹھاتا ہے۔کنیز کی جدوجہد، اس کی بے بسی اور معاشرتی دباؤ کو ماہرانہ بیانیہ کے ذریعے اجاگر کیا گیا ہے، جبکہ قاتل کی اصل شناخت کہانی کے اختتام تک مبہم رکھی گئی ہے۔ یہ کہانی عورت کی محبت کے پیچیدہ اور متنوع پہلوؤں پر قاری کو گہرے غور و فکر کی دعوت دیتی ہے۔

ڈاکٹر ناصر عباس نیر کے کچھ دیگر افسانوں میں، خاص طور پر "درخت باتیں ہی نہیں کرتے۔۔۔"، "خاک کی مہک"، "جھوٹ کا فیسٹیول"، "مرنے کے بعد مسلمان ہوا جا سکتا ہے؟"، "فرشتہ نہیں آیا"، "کفارہ"، "کہانی کا کوہ ندا" وغیرہ میں مقامیت، دیہی ثقافت کی عکاسی نمایاں، منفرد اور گہرے انداز میں کی گئی ہے۔ ان افسانوں میں پنجاب کی دیہی معاشرت، اس کی سماجی معاملات، بود و باش، رہن سہن اور دیہی زندگی کے مسائل کو نہایت باریکی سے پیش کیا گیا ہے۔ ان افسانوں میں دیہات کی زندگی صرف ایک پس منظر کے طور پر نہیں، بلکہ ایک زندہ کردار کے طور پر ظاہر ہوتی ہے، جس میں انسانوں کے ساتھ ساتھ مٹی، زمین، اور اس کے مسائل کا ذکر بھی ملتا ہے۔ ناصر عباس نیر دیہات کے طبقاتی نظام اور اس سے جنم لینے والے مسائل کو نمایاں کرتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں جاگیردارانہ نظام کے اثرات، محنت کش طبقے کی مشکلات، اور سماجی تعصبات کی تصویر کشی بھی کی گئی ہے۔ ان کے ہاں دیہی کردار اپنی تہذیب اور رواجوں کے ساتھ جڑے ہوئے نظر آتے ہیں، لیکن ان کے ساتھ سماجی ناانصافیوں اور استحصالی رویوں کا سامنا بھی کرتے ہیں۔ غیرت کے نام پر قتل، تشدد اور اخلاقیات جیسے موضوعات ان کے افسانوں کا حصہ ہیں۔ یہ موضوعات دیہی معاشرت کی حقیقی عکاسی کرتے ہیں، جہاں ان مسائل کو اکثر روایتی اقدار کے طور پر قبول کیا جاتا ہے۔ ناصر عباس نیر ان رویوں پر تنقید کرتے ہیں اور ان کے نفسیاتی و سماجی مسائل کو اجاگر کرتے ہیں۔ کچھ افسانوں میں دیہی زندگی کے ساتھ گہرے روحانی سوالات کو بھی اٹھایا گیا ہے، جیسے زندگی اور موت کے مفہوم، مذہب کا کردار، اور انسان کے روحانی تجربات وغیرہ۔ مثال کے طور پر، ''کہانی کا کوہ ندا'' میں کہانی اور حقیقت کے تعلق پر سوالات اٹھائے جاتے ہیں، مصنف اپنی فنکاری سے دیہی زندگی کی عام سی کہانیوں کو ایک فلسفیانہ گہرائی دیتے ہیں۔ ناصر عباس نیر کے افسانوں میں دیہی زندگی کی جزئیات، مثلاً زمین کا ذکر، مٹی کی مہک، کسانوں کی زندگی، گاؤں میں فطرت کے مناظر اور دیہاتی طرزِ زندگی کی روزمرہ کی جدوجہد کو حقیقت پسندانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ حقیقت نگاری دیہی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو واضح کرتی ہے، جن میں محنت، محرومی اور امید کے عناصر شامل ہیں۔ مصنف دیہی زندگی کو صرف ایک سادہ ماحول کے طور پر نہیں دیکھتے بلکہ اسے وجودی سوالات اور فلسفیانہ مباحث کے لیے ایک پلیٹ فارم کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ ان کے افسانے قارئین کو یہ سوچنے پر مجبور کرتے ہیں کہ دیہی زندگی میں چھپی کہانیاں کیا صرف حقیقت کی نمائندگی کرتی ہیں یا ان میں کوئی دوسرا امکان بھی موجود ہے؟ ناصر عباس نیر کے یہ افسانے فطرت، دیہی ثقافت اور مقامیت کی ایسی تصویر پیش کرتے ہیں جو نہ صرف حقیقت پسندانہ ہے بلکہ گہرے معنوی پہلو بھی رکھتی ہے۔

ڈاکٹر ناصر عباس کے کچھ افسانے دیہی زندگی کے مسائل اور اس کی روحانی و فلسفیانہ جہات کو اس انداز سے پیش کرتے ہیں کہ قاری صرف کہانی نہیں پڑھتا بلکہ دیہاتی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو محسوس بھی کرتا ہے۔ ناصر عباس نیر کے افسانے "ولدیت کا خانہ" میں بھی ایسے ہی عناصر موجود ہیں۔ یہ افسانہ ماسٹر اسمٰعیل کے کردار کے گرد گھومتا ہے۔ جس کی ذاتی کشمکش اور فکری سفر دیہات کی سادہ مگر گہری زندگی کی عکاسی کرتی ہے۔ افسانے میں بوہڑ کے درخت کے حوالے سے منظر نگاری کی گئی ہے۔ جو کہ دیہاتی زندگی میں ایک اہم علامت کے طور پر سمجھا جاتا ہے۔ مرقوم ہے:

"بستی کے عین بیچ بوہڑ کا درخت۔۔۔۔سائیں کی داڑھی کی طرح زمین کی طرف لٹکی شاخیں۔"(۸)

یہ درخت دیہات میں نہ صرف سایہ اور سکون کا ذریعہ ہوتا ہے بلکہ روحانیت اور فطرت سے جڑت کی علامت بھی ہوتا ہے۔ ماسٹر اسمٰعیل کا درخت کے نیچے بیٹھ کر اپنی ذات اور کائنات پر غور و فکر کرنا دیہات کے لوگوں کے قدرت سے گہرے تعلق کو ظاہر کیا گیا ہے۔ درخت کے ذریعے انسان اور مٹی کے تعلق کو اجاگر کرنا دیہاتی ثقافت کی عکاسی ہے۔ دیہات کی ثقافت میں روحانی رہنماؤں کی اہمیت نمایاں ہوتی ہے۔ اس افسانے میں سائیں اور شاہ صاحب کے کردار اسی روایت کی عکاسی کرتے ہیں۔ سائیں کی ادھوری باتیں اور شاہ صاحب کے ذریعے ان کی وضاحت دیہاتی زندگی کی پراسراریت اور لوگوں کے مسائل کو حل کرنے کی روایت کو بیان کرتی ہیں۔ یہ کردار نہ صرف مذہبی بلکہ فکری رہنمائی کے لیے دیہاتی لوگوں کے رجحان کو ظاہر کرتے ہیں۔ مصنف نے فطرت اور مٹی کو اہمیت دی ہے۔ مٹی کو عورت کے بطن سے تشبیہ دینا، اور درختوں کی مثال کے ذریعے انسان اور فطرت کے گہرے رشتے کو بیان کرنا دیہاتی ماحول کا ایک اہم پہلو ہے۔ یہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ دیہات میں قدرتی عناصر کو انسانی زندگی سے کیسے جوڑا جاتا ہے۔ ماسٹر اسمٰعیل کی تنہائی اور خود کلامی دیہاتی زندگی کے اس پہلو کو اجاگر کرتی ہے، جہاں لوگ اکثر اپنے اندرونی سوالات کے ساتھ وقت گزارتے ہیں۔

مجموعی طور دیکھا جائے تو افسانہ ''ولدیت کا خانہ'' میں دیہاتی زندگی کی سادگی، فطرت سے جڑت اور سماجی پیچیدگیوں کو نہایت خوبصورتی سے بیان کیا گیا ہے۔ بوہڑ کے درخت کی علامت، سائیں اور شاہ صاحب کے کردار، مٹی اور عورت کا رشتہ اور ماسٹر اسمٰعیل کی فکری کشمکش دیہاتی ثقافت کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی کرتے ہیں۔ ناصر عباس نیر نے شعور کی رو کی تکنیک استعمال کرتے ہوئے دیہاتی زندگی کی فلسفیانہ گہرائی اور انسانی نفسیات کو موثر انداز میں پیش کیا ہے۔ جو قاری کو غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔ ناصر عباس نیر کے چوتھے افسانوی مجموعے کے پہلے افسانے ''درخت باتیں ہی نہیں کرتے۔۔۔'' میں دیہی زندگی اور فطرت کے گہرے تعلق کو حساس انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ مرکزی کردار دادا کے ذریعے درختوں اور پرندوں سے محبت اور ان کی حفاظت کا شعور واضح کیا گیا ہے۔ افسانہ فطرت کو صرف مادی وسائل کے طور پر نہیں بلکہ زندہ اور معنویت سے بھرپور حصہ سمجھتا ہے، جہاں درختوں کی کٹائی کو بیٹے کی بیع کی طرح دکھایا گیا ہے۔ دادا کی ماحولیاتی فکر اور دیہی زندگی سے گہری وابستگی اس کہانی کا محور ہے، جو محبت، سادگی اور ماحول کی حفاظت کا درس دیتی ہے۔ مصنف دادا کی درختوں اور پرندوں کے ساتھ لگاؤ کو بہت عمدگی پیش کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"گھر آتے تو ہر درخت کے نیچے باری باری بیٹھا کرتے تھے۔ گھر میں چار درخت تھے۔ ٹاہلی،

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 17. Issue 01, June 2025

شرینہ، کیکر اور شہتوت۔ شہتوت سے کبھی کبھی الرجی بھی انھیں ہو جایا کرتی تھی، مگر وہ اس کے نیچے چارپائی ڈلوا کر بیٹھا کرتے۔ ابا سے، اماں سے، دادی سے، چچا سے باتیں کرتے۔ ان کی باتوں میں دنیا جہان کی باتیں ہوتیں؛ رشتہ داروں کی، آس پاس کے زمین داروں کی زمینوں کی فصلوں کی کبھی کبھی مذہب اور سیاست پر بھی بات کر لیتے۔ ہر بار ان میں پرندوں اور درختوں کی باتیں بھی ہوتی تھیں۔ ان کے دنیا جہان میں کتنا کچھ شامل تھا! وہ بتاتے کہ کب درختوں کے پتے گرتے ہیں، کب کونپلیں پھوٹتی ہیں۔ اس وقت ان کو کتنا پانی دینا چاہیے۔ کب درختوں کو چھانگنا چاہیے اور کون سی شاخیں چھانگنی چاہئیں۔ کسی درخت پر کون سا پرندہ گھونسلا بناتا ہے اور کس پر محض وقت گزاری کے لیے اور شاید ہماری اور دوسرے پرندوں کی باتیں سننے، سنانے آتا ہے۔ کون سا پرندہ کب انڈے دیتا اور سیتا۔"[۹]

افسانے میں فطرت کو انسانی جذبات کے آئینے کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ پرندوں کی بے چینی کو ہندوؤں اور سکھوں کی نقل مکانی سے جوڑنا فطرت اور انسانی المیے کے درمیان تعلق کو واضح کرتا ہے۔ دادا کا کبوتروں کی جوڑی سے وابستگی ان کے اندرونی دکھ اور خلا کی عکاسی کرتی ہے، جو ایک گمشدہ شے کی تلاش میں ہمیشہ مضطرب رہتا ہے۔ ناصر عباس نے افسانہ میں فطرت، ماحول اور دیہی زندگی کے درمیان گہرے تعلق کو ایک ادبی اور علامتی انداز میں پیش کیا ہے۔ یہ کہانی نہ صرف ماحولیات کے بارے میں شعور پیدا کرتی ہے بلکہ انسانی زندگی میں فطرت کی اہمیت اور جذباتی اثرات کو بھی نمایاں کرتی ہے۔ دادا کا کردار دیہی زندگی کی علامت ہے، جو جدید دور کی تیز رفتار زندگی میں کھو جانے والے سکون اور فطرت سے جڑے جذبات کی یاد دلاتا ہے۔

ڈاکٹر ناصر عباس نیر اپنے افسانوں میں انسانی نفسیات کی گہرائیوں کو منفرد انداز میں پیش کرتے ہیں، جہاں کرداروں کی داخلی کشمکش، جذباتی تضادات اور شعور و لاشعور کے تصادم کو باریکی سے بیان کیا گیا ہے۔ ان کی کہانیوں میں جنسی نفسیات، محبت اور خواہشات کی پیچیدگیاں اہم موضوعات ہیں جو کرداروں کی شخصیت سازی میں کلیدی کردار ادا کرتی ہیں۔ افسانہ "فرشتہ نہیں آیا" میں ایک معصوم بچی کی تکلیف دہ جدوجہد دکھائی گئی ہے، جو غیر منصفانہ حالات میں اپنی ہمت اور حوصلے سے زندگی کا مقابلہ کرتی ہے، جبکہ اس کی مدد کے لیے کوئی فرشتہ نہیں آتا۔ ناصر عباس نیر کے کردار مشکلات کے باوجود ہتھیار نہیں ڈالتے بلکہ نئی راہیں تلاش کرتے ہیں، جو ان کی زندگی سے جدوجہد اور امید کی عکاسی کرتی ہیں۔ یہ کہانی جنسیت اور طاقت کے مظاہر کو انسانی جدوجہد اور معصومیت کے تناظر دیکھا جا سکتا ہے۔ اس میں ایک معصوم بچی کی زندگی میں پیش آنے والے دردناک واقعات کو علامتی اور فکری انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ کہانی میں مرد کا کردار "جنسی عفریت" کے طور پر پیش کیا گیا ہے، جو جنسیت کو طاقت اور غلبے کے آلے کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ یہ اس حقیقت کی عکاسی کرتا ہے کہ انسانی حیوانیت بعض اوقات جنسیت کے ذریعے اپنے غالب اثرات چھوڑتی ہے۔ بچی کے ساتھ پیش آنے والا واقعہ جنسیت کی اس حقیقت کو آشکار کرتا ہے کہ یہ ہمیشہ رضامندی اور محبت کا اظہار نہیں ہوتا بلکہ اکثر اوقات جبر اور استحصال کا ذریعہ بھی بن جاتا ہے۔

کہانی میں "فرشتے" امید کی علامت ہیں جو کمزور افراد رکھتے ہیں، لیکن کہانی یہ پیغام دیتی ہے کہ مدد خود اپنی جدوجہد سے

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 17. Issue 01, June 2025

حاصل کرنی ہوتی ہے۔ جنسی استحصال کا شکار افراد اکثر تنہا ہوتے ہیں کیونکہ سماج یا کوئی ماورائی طاقت ان کی مدد نہیں کرتی۔ بچی کی مضبوطی اس بات کی نشانی ہے کہ مظلوم کو اپنی طاقت سے حالات کا سامنا کرنا چاہیے، نہ کہ ماورائی مدد کا انتظار۔ مصنف نے جنسیت کو حیوانیت سے جوڑ کر دکھایا ہے کہ جنسی جذبات انسانیت اور اخلاقیات کی حدیں توڑ دیتے ہیں، جو نہ صرف متاثرہ فرد کو نقصان پہنچاتے ہیں بلکہ انسان اور حیوان کے فرق کو مٹاتے ہیں۔ یہ کہانی اس بات کی نشاندہی بھی کرتی ہے کہ سماج میں جنسیت صرف ایک ذاتی تجربہ نہیں بلکہ ایک سماجی مسئلہ بھی ہے۔ جنسی استحصال کو انفرادی فعل کے بجائے ایک سماجی رویے کے طور پر پیش کیا گیا ہے جو انسانی رویوں اور معاشرتی ڈھانچے کی خامیوں کو نمایاں کرتا ہے۔ اسی طرح مصنف نے افسانہ "کفارہ" میں جنسی جذبات کی کشمکش اور ان کے دبانے کے نتائج کو موضوع بنایا گیا ہے۔ یہ کہانی ایک ریٹائرڈ فوجی، خداداد، کی داخلی کشمکش کو بیان کرتی ہے جو بظاہر پنجگانہ نماز کا پابند اور ایک دیندار شخص ہے، لیکن اس کی شخصیت کے اندر چھپی ہوئی خواہشات اسے ایک عجیب الجھن میں مبتلا کر دیتی ہیں۔

کہانی کا آغاز خداداد کے ایک واقعے سے ہوتا ہے، جہاں اسے ایک عورت، نوری، کی لاش ملتی ہے۔ اس عورت کی لاش کے برہنہ حصے دیکھ کر خداداد کی نظریں ٹھہر جاتی ہیں، لیکن بجائے اس کے کہ وہ اس لاش کے ورثا کو اطلاع دے یا اس صورتحال سے نپٹنے کی کوئی عملی کوشش کرے، وہ اپنی عبادت کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ وہ ذہن میں مردہ نوری کے بدن کے خدوخال سوچتا رہا اور ساتھ نماز بھی پڑھتا رہا۔ مصنف خداداد کے اس عمل کو افسانے میں یوں لکھتے ہیں:

"جب وہ نماز ادا کر رہا تھا، اسے نوری کے سینے کا ابھار، گندمی پیٹ، بھورے سیاہ بال، اور سرد چہرہ برابر یاد آتا رہا تھا، مگر اس نے پوری توجہ نماز پر مرکوز رکھنے کی کوشش کی تھی۔"(۱۰)

یہ عمل خداداد کی شخصیت میں تضاد کو ظاہر کرتا ہے، جہاں وہ ظاہری طور پر ایک نیک شخص ہے لیکن اندر سے اس کی شخصیت کمزوریوں سے بھرپور ہے۔ اس طرح خداداد کے اندر ایک لاشعوری خواہش ابھرنے لگتی ہے جو اس کے ضمیر کو کٹہرے میں لا کھڑا کرتی ہے۔ اگرچہ اس نے نوری کے ساتھ کوئی ظاہری زیادتی نہیں کی تھی اور نہ ہی وہ اس کا قاتل تھا، لیکن اس نے اپنی نظروں کے ذریعے تہذیبی اور اخلاقی حدود کو پامال کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا ضمیر اسے مسلسل ملامت کرتا رہتا ہے۔ کہانی میں ایک اہم موڑ اس وقت آتا ہے جب خداداد ایک خواب دیکھتا ہے۔ اس خواب میں اس کی لاشعور میں چھپی جنسی خواہش کی تکمیل پر جو تسکین حاصل کرتا ہے، یہ تسکین اسے ذہنی طور پر الجھا کر رکھ دیتی ہے۔ خواب خداداد کے ضمیر کو جھنجھوڑ دیتا ہے اور اسے اپنی اخلاقی گراوٹ کا ادراک ہوتا ہے۔ یہی ادراک اسے اس مقام پر لے آتا ہے جہاں وہ اپنے جرم کا کفارہ ادا کرنے کا فیصلہ کرتا ہے۔ خداداد کا کفارہ یہ تھا کہ وہ اس عورت، نوری، سے نکاح کرے، جو اب زندہ نہیں رہی تھی۔ یہ فیصلہ خداداد کی نفسیاتی پیچیدگی کو ظاہر کرتا ہے، جہاں وہ اپنے گناہ کا بوجھ اٹھانے کے لیے ایک انتہائی قدم اٹھانے کو تیار ہے۔ افسانے کا اختتام خداداد کے اللہ بخشے سے کیے گئے سوال پر ہوتا ہے: "کیا کسی کی موت کے بعد اس سے نکاح کیا جا سکتا ہے؟"(۱۱) یہ سوال خداداد کی داخلی کشمکش اور اس کی حقیقت پسندی کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔

ناصر عباس نیر اپنے افسانوں میں انسانی نفسیات، اندرونی کشمکش اور جذباتی الجھنوں کو گہرائی سے پیش کرتے ہیں۔ ان کے کردار سماجی دباؤ، ماضی کی یادوں اور خواہشات کے تصادم میں مبتلا ہوتے ہیں۔ ان کے افسانے وجود، اخلاقیات اور انسانی تعلقات جیسے

پیچیدہ موضوعات پر روشنی ڈالتے ہیں۔ان کے مجموعے "جب تک ہے زمین" کا افسانہ "حقہ، پانی" علامتی انداز میں انسانی خواہشات اور اندرونی تضادات کی عکاسی کرتا ہے۔ کہانی میں غار، ناگ، جھونپڑی، حقہ اور پانی جیسے عناصر انسانی نفسیات کے مختلف پہلوؤں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ داڑھی والے شخص کا کردار نفسیاتی دباؤ کا سبب بنتا ہے جبکہ حقہ پینے کی خواہش ترک کرنے کے باوجود کشش برقرار رہتی ہے، جو اندرونی کمزوری اور تضاد ظاہر کرتی ہے۔ کہانی کا ماحول بے یقینی اور الجھن کا عالم دکھاتا ہے، جہاں خواہشات، خوف اور ضرورتیں انسان کو بے بس کر دیتی ہیں۔ یہ افسانہ فلسفیانہ اور نفسیاتی موضوعات کو خوبصورتی سے بیان کرتا ہے۔ جہاں علامتی اور تجریدی عناصر انسانی وجود کی پیچیدگیوں اور اس کے شعوری ولاشعوری پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہیں۔ کہانی ایک ایسی دنیا کی عکاسی کرتی ہے جو بظاہر غیر حقیقی ہے لیکن اس کے اندر چھپے مفہوم ہر انسان کی داخلی دنیا سے گہرے تعلق رکھتے ہیں۔اسی فکر پر ناصر عباس نیر نے افسانہ "یاد اور بھول کا کھیل" میں انسانی نفسیات اور سماجی تعلقات کے پیچیدہ پہلوؤں کو بہت خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔افسانے میں مرکزی کردار کی گفتگو اور خیالات کے ذریعے انسان کے اندر کی کشمکش، اخلاقی سوالات اور یادوں کے اثرات کو بہت عمدگی سے دکھایا گیا ہے۔افسانے میں اخلاقی و نفسیاتی سوالات کی کھوج کی گئی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر انسان کو کسی کی زندگی بچانے یا لینے کا موقع ملے تو وہ کس اصول کے تحت فیصلہ کرے گا؟ مرکزی کردار اپنے دوست شہریار سے بحث کرتے ہوئے مختلف حالات میں قتل کے جواز بیان کرتا ہے۔ اس میں بہت سی نفسیاتی گہرائیاں چھپی ہوئی ہیں، جیسے کہ ماضی کی یادیں، دل میں پھیلی نفرت، یا ایک لمحے کی نفسیاتی حالت جس میں کسی کو نقصان پہنچانا معقول لگتا ہے۔

انسان کسی جان لینے کے لیے یاد اور بھول دونوں کے کھیل میں پھنس کر سامنے والے کی زندگی کا فیصلہ کرتا ہے دراصل "یاد اور بھول کا کھیل" ہی اس افسانے کا مرکزی خیال ہے۔ مرکزی کردار نے اپنی زندگی کی مختلف یادوں کی بنیاد پر فیصلہ کرتا ہے کہ وہ کس کو قتل کرے گا؟ یہ یادیں اس کی زندگی کے اہم لمحات ہوتے ہیں۔ان کے اثرات اس کے موجودہ فیصلوں پر پڑتے ہیں۔ مثلاً بندر کا تماشا دکھانے والے کے حوالے سے یاد، چوکیدار کی ظلم کی کہانی اور جوتا مرمت کرنے والے سے گزرے تجربے ان یادوں کی مثالیں ہیں، مرکزی کردار ناسٹلیجیا کی کیفیت میں مبتلا رہتا ہے۔ انہی یادوں کی بنیاد پر وہ کسی کو قتل کرنے کا فیصلہ کرتا ہے۔

ناصر عباس نیر نے کردار کے ذریعے یہ سمجھایا ہے کہ ہر انسان کے اندر ایک انتقام کا جذبہ چھپا ہوتا ہے۔ جو حالات اور تجربات کی بنیاد پر ابھرتا ہے۔ اس کی باتوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انسان محض حالات اور ماضی کے اثرات سے متاثر ہو کر اپنے فیصلے کرتا ہے، نہ کہ کسی اخلاقی یا منطقی اصول سے۔ افسانے میں دونوں کردار شہریار اور اس کے دوست (مرکزی کردار) کے سوال، جواب اور دلچسپ گفتگو کے ذریعے مصنف نے سماجی مسائل پر بھی تنقید کی ہے۔ چوکیدار کی بیوی پر تشدد، بندر والے کے ساتھ بچپن کا واقعہ، اور دیگر شخصیات کی کمزوریوں کو بیان کیا گیا ہے۔ ان سب کے ذریعے مصنف معاشرتی ناہمواریوں اور انسانی تعلقات کی بگڑتی ہوئی صورتحال کو اجاگر کرتے ہیں۔

افسانے کا اختتام بہت گہرا اور معنی خیز ہے۔ جہاں مرکزی کردار آخر کار اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ جان لینا یا بچانا دراصل ایک یادوں اور بھول کا کھیل ہے۔ اس میں انسان کے اندر کی پیچیدگیاں اور اس کی یادوں کا کردار بہت اہمیت رکھتا ہے۔ مصنف نے اس اختتام

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 17. Issue 01, June 2025

سے انسان کی بے چینی اور اس کے غیر متوقع ردعمل کو خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ افسانے کے اختتام میں مرقوم ہے:

"شہر یار نے کہا۔ جان لینا اور بچانا، یاد اور بھول کا کھیل ہے! کوئی اس کھیل کو کھلانے والا بھی تو ہو گا۔ دونوں پہلے ہنسے اور پھر سنجیدہ اور ساتھ ہی کسی نامعلوم بات پر رنجیدہ ہوئے۔"(۱۲)

مجموعی بات کی جائے تو ڈاکٹر ناصر عباس نیر نے اس افسانہ میں انسان کے اندر کی پیچیدگیوں، نفسیاتی جنگوں اور معاشرتی مسائل کو بہت گہرے اور حقیقت پسندانہ طریقے سے بیان کیا ہے۔ اس میں نہ صرف ایک انسان کی اندرونی کشمکش کی عکاسی کی گئی ہے بلکہ سماجی تعلقات اور اخلاقی سوالات پر بھی سنجیدگی سے غور کیا گیا ہے۔ ایسی ہی انسان کی اندرونی اور نفسیاتی الجھنوں پر مبنی افسانہ "آوازیں اور سایہ" ناصر عباس نیر کی تخلیقی اور فکری صلاحیتوں کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ مصنف اس افسانے میں انسانی ذہن کی پیچیدگیوں، یادوں اور وجودی سوالات کو ایک علامتی اور نفسیاتی انداز میں پیش کرتا ہے۔ یہ کہانی ایک فرد کی داخلی کشمکش اور روحانی الجھنوں کو فطرت کی آوازوں، سایوں اور پراسراریت کے ذریعے اجاگر کرتی ہے۔ مرکزی کردار کی سوچوں اور ماحول کا غیر متعین ہونا قاری کو ایک منفرد تجربہ فراہم کرتا ہے، جہاں حقیقت اور تخیل، ماضی اور حال کی سرحدیں مدھم ہو جاتی ہیں۔

کہانی کا مرکزی کردار ایک پراسرار آواز کا تعاقب کرتا ہے جو اس کی اندرونی بے چینی، ماضی کی غلطیوں، اور جذباتی کشمکش کی علامت ہے۔ فطرت کے عناصر جیسے کوؤں کی آواز، شیشم کے درخت، اور گلہریاں کردار کی ذہنی کیفیت کی عکاسی کرتے ہیں اور ایک غیر یقینی ماحول قائم کرتے ہیں جہاں وہ تنہائی اور الجھن محسوس کرتا ہے۔ کہانی کی شاعرانہ اور علامتی زبان قاری کو کردار کی غیر یقینی اور جذباتی حالت کے قریب لے جاتی ہے، جبکہ ماضی کی چیزیں اس کے موجودہ حال پر اثر دکھاتی ہیں۔ پروفیسر شفیق اکبر کے فلسفیانہ مکالمے انسان کے اعمال، عقل، اور روحانی حقیقتوں کے درمیان تضاد کو ظاہر کرتے ہیں، اور زندگی کو ایک عظیم غلطی کے طور پر پیش کرتے ہیں، جسے انسان اپنی محدود فہم کی وجہ سے سمجھ نہیں پاتا۔ افسانے کا اختتام ایک مثبت اور فلسفیانہ نوٹ پر ہوتا ہے۔ جہاں مرکزی کردار اپنی زمین کو انسانوں اور پرندوں کے لیے وقف کرنے کا فیصلہ کرتا ہے۔ یہ اقدام اس کی داخلی کشمکش اور خوف کے خاتمے کی علامت ہے۔ آوازیں اب خوف یا بے چینی کی نہیں بلکہ سکون اور سمجھ کے احساس سے جڑی ہوئی ہیں۔ مصنف لکھتے ہیں:

"میں پروفیسر شفیق اختر کو صرف یہ بتانے گیا ہوں کہ میں نے چند دنوں اس کی بتائی ہوئی آیات کا ورد کیا تھا۔ وہ آوازیں پھر بھی آتی رہیں تھیں اور وہ سایہ بھی۔ البتہ میں نے اس گھر کی چار دیواری گرا دی ہے اور چار ایکڑ میں انگور، آم، جامن، سنگترے کے پیڑ لگوا نام دیے ہیں اور وصیت کر دی ہے کہ یہ زمین میرے بیٹے کے نام رہے گی مگر اس کے باغات کے پھلوں پر پرندوں اور راہ گیروں کا حق ہو گا۔"(۱۳)

"آوازیں اور سایہ" ایک ایسی کہانی ہے جو قاری کو انسانی زندگی کی ان جہتوں پر غور کرنے پر مجبور کرتی ہے جو عام طور پر ہماری روزمرہ کی سوچ سے ماوراء ہوتی ہیں۔ انسان کی سب سے بڑی جدوجہد خود اپنے اندرونی خوف اور گناہوں سے ہوتی ہے، اور جب وہ ان پر قابو پالیتا ہے تو سکون حاصل کر لیتا ہے۔ ایسا ہی اس کہانی میں دکھایا گیا ہے۔

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 17. Issue 01, June 2025

ناصر عباس نیر کا افسانہ "کھنڈر کی تختی" ایک عمیق تمثیلی تحریر ہے۔ اس افسانے میں انسان کی حرص، بے یقینی اور معاشرتی رویوں پر تنقید کی گئی ہے۔ یہ افسانہ نہ صرف مادی اشیا کی قدر و قیمت کو سماجی نفسیات کے تناظر میں بیان کیا گیا ہے بلکہ انسانی عقیدت، دھوکہ دہی اور اجتماعی حماقت کے پہلوؤں کو بھی واضح کرتا ہے۔ کہانی کا بنیادی محور ایک کھنڈر سے برآمد ہونے والی تختی ہے۔ جسے ابتدا میں ایک عام آثار قدیمہ کی شے سمجھا جاتا ہے۔ لیکن جیسے ہی تختی پر لکھی تحریر کے معانی ظاہر ہونے لگتے ہیں، یہ محض ایک تاریخی دریافت سے بڑھ کر ایک اجتماعی جنون اور منافع بخش کاروبار کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ افسانہ انسانی معاشرے میں سچائی اور افسانویت کی تفریق کو دھندلا کر دینے والے عوامل کو نمایاں کرتا ہے۔

افسانے میں کھنڈر اور تختی سرمایہ داری نظام کی علامت کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ عجائب گھر کی انتظامیہ جو ابتدا میں علم و تحقیق کے لیے کام کرتی دکھائی دیتی ہے، جلد ہی منافع کمانے والے ادارے میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ تختی کی عبارت کا ترجمہ بھی علم کی خدمت کے بجائے کاروباری مقاصد کے تحت کیا جاتا ہے۔ تختی کی حقیقت یہ ہے کہ اس پر سرے سے کچھ لکھا ہوا ہی نہیں تھا۔ یہ سب دھوکہ دہی اور جھوٹ پر مبنی سماجی رویوں کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ اس بات کا اشارہ ہے کہ کس طرح حقیقت کو مسخ کر کے عوام کو گمراہ کیا جا سکتا ہے۔ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

> "اس تختی پر جو کچھ لکھا ہوا ہے، وہ سچ ہو رہا ہے۔ اس تختی کی پانچویں سطر میں لکھا تھا کہ ایک وقت آئے گا، جب لوگ روٹی، عورت، روپے کی خاطر نہیں، اپنی بات منوانے کی خاطر قتل کیا کریں گے اور بات منوانے کے کئی طریقے ہوں گے۔۔۔۔ بات منوانے والوں کے کئی فرقے بن جائیں گے۔ آج یہ سچ ہو رہا ہے۔ اس سے زیادہ ہماری دریافت کردہ تختی کی سچائی کا ثبوت کیا ہو سکتا ہے؟ عجائب گھر کے کیوریٹر نے اخبارات کو بریفنگ دیتے ہوئے کہا۔"(۱۴)

دراصل افسانے میں تختی کو ایک علامت کے طور پر پیش کیا گیا ہے جو سچائی اور پیش گوئی کے بہانے انسانی سماجی خرابیوں کو نمایاں کرتی ہے۔ مصنف نے یہ بات بھی عیاں کی ہے کہ کس طرح لوگ ماضی کے مبہم یا غیر واضح بیانات کو موجودہ حالات کے جواز کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ دراصل معاشرتی اور فکری تقسیم کی حقیقت کو ظاہر کرتی ہے، جہاں لوگ نظریات کو منوانے کے لیے تشدد اور فرقہ بندی کا سہارا لیتے ہیں۔ تختی کو پڑھنے والے ماہرین کے نام صیغہ راز میں رکھنا، علم کو طاقت کے ذریعے قابو میں رکھنے کی علامت ہے۔ یہ بھی دکھایا گیا ہے کہ علم کو کس طرح عوام پر حاوی ہونے کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو مصنف نے اس افسانے "کھنڈر کی تختی" کے ذریعے انسانی نفسیات، سماجی رویوں اور مادی حرص پر تنقید کی ہے۔ یہ افسانہ قاری کو یہ سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ سچائی، علم اور حقیقت کی تعریف کیسے سماجی، سیاسی اور معاشی مفادات کے تابع ہو سکتی ہے۔ یہ افسانہ ناصر عباس نیر کی فکری گہرائی اور ان کی تمثیلی بیان کی مہارت کا عمدہ مظہر ہے۔

مصنف کا افسانہ "اسے عورت نے جنم نہیں دیا" انسانی وجود، معاشرتی رویوں اور انفرادیت کے سوالات کو گہرے فلسفیانہ اور سماجی انداز میں پیش کرتا ہے۔ کہانی کا مرکزی کردار ایک ایسا منفرد اور غیر روایتی فرد ہے جو معاشرتی حدود اور روایات سے آزاد

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 17. Issue 01, June 2025

دکھائی دیتا ہے۔ اس کے بارے میں فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ وہ پسندیدہ ہے یا ناپسندیدہ، کیونکہ وہ معاشرتی اصولوں اور توقعات سے مکمل طور پر مختلف ہے۔ یہ کردار اپنی انفرادیت کے ساتھ کہانی کا محور و مرکز ہے اور عام انسانوں جیسا طرزِ زندگی نہیں رکھتا۔ وہ بازار میں آزادانہ گھومتا پھرتا ہے اور ہر گزرنے والا اسے دیکھ کر اپنی رائے قائم کرتا ہے۔ کوئی اسے جاسوس سمجھتا ہے، کوئی پاگل، کچھ لوگ اسے "یملا" کہتے ہیں، اور بعض اسے بچگانہ ذہنیت کا نفسیاتی مریض قرار دیتے ہیں۔ اس کے برعکس، یہ کردار نہ صرف اپنے چہرے کے خدوخال بلکہ اپنی پہچان کو بھی پوشیدہ رکھنے کی کوشش کرتا ہے، گویا وہ معاشرے کے طے شدہ اصولوں سے انکار کی علامت ہو۔

یہ افسانہ انسانی نفسیات، شناخت، اور سماجی رویوں کی گہری عکاسی کرتا ہے۔ یہ پراسرار کردار معاشرتی حدود اور شناخت کے عام تصور کو چیلنج کرتا دکھائی دیتا ہے۔ یہ کردار ایک علامتی وجود ہے جو معاشرتی نظام میں موجود جبر، تعصب، اور استحصال کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس کی عدم شناخت اور بدلتے خدوخال اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ معاشرہ کس طرح انفرادیت کو قبول کرنے کے بجائے اپنے معیارات پر پرکھتا اور رد کرتا ہے۔ لوگوں کو شک گزرا کہ اسے نفسیاتی عارضہ ہے اور علاج معالجے کے بعد ٹھیک ہو جائے گا، تو انہوں نے ماہرین کو دکھایا لیکن ماہرین نے اسے ہر طرح سے جانچنے اور تشخیص کرنے کے بعد کچھ خاص نتائج نہ حاصل کر سکے۔ انہوں نے ایک ایسی رائے دی جو صرف اس ایک کردار سے پورے سماج کے کرداروں کی بھی عکاسی ہوتی ہے اور اسی چونکا دینے والی بات پر افسانے کا اختتام بھی ہو جاتا ہے۔ ناصر عباس نیر اس اختتامی صورتحال کو یوں لکھتے ہیں:

> "ان ماہرین کی عادت ہے کہ جب کسی مشکل چیز کو سمجھ نہیں پاتے تو مفروضہ گھڑتے ہیں۔ انھوں نے یہ مفروضہ گھڑا ہے کہ یہ اصل میں کوئی ایک شخص ہے ہی نہیں۔ کوئی اس کی صحیح عمر کا اندازہ نہیں لگا سکتا۔ کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ اس جگہ کب سے ہے اور کہاں سے آیا۔ صرف ایک بات اطمینان سے کہی جا سکتی ہے کہ وہ بچہ نہیں ہے۔ اس نے صرف ایک ہی کوشش کی ہے اور لگا تار کی ہے کہ کوئی اس کا چہرہ پوری طرح نہ دیکھ سکے۔ وہ مسلسل اپنے چہرے کے خدوخال بدل لیتا ہے۔ چہرے کے نیچے سب ایک جیسے ہیں۔ ان ماہرین نے آخری بات کہنے سے پہلے پورے بازار کا چکر لگایا۔ واپس آ کر کہا کہ وہ یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ اس شخص کے چہرے کے بدلتے خدوخال عین وہی ہیں جو بازار میں موجود لوگوں کے ہیں۔ وہ واقعی عورت کی کوکھ سے پیدا ہوا ہے نہ کسی دوسرے سیارے سے آیا ہے۔ یہ زمین سے بھی نہیں نکلا۔"(۱۵)

یہ کردار، جو اپنی شناخت کو بدلتے خدوخال کے ذریعے چھپاتا ہے، اس بات کی علامت ہے کہ معاشرتی نظام میں فرد کی اصل پہچان کو کچل دیا جاتا ہے یا وہ خود اپنی شناخت سے فرار چاہتا ہے۔ اس کے چہرے کے خدوخال بازار میں موجود لوگوں سے مماثلت رکھتے ہیں، اس بات کا اشارہ ہے کہ یہ کردار دراصل معاشرے کے مختلف رویوں اور افراد کا مجموعہ ہے۔ یہ ایک اجتماعی وجود یا انسانیت کا علامتی عکس بن جاتا ہے۔ جب معاشرہ کسی فرد یا چیز کو سمجھنے میں ناکام ہوتا ہے تو وہ اپنی محدود سوچ اور تعصبات کے مطابق اس کی وضاحت کرنے کی کوشش کرتا ہے، جو اکثر حقیقت سے دور ہوتی ہے۔

ناصر عباس نیر کے افسانے ''بوڑھے کا قتل'' کا موضوع نہایت گہرائی و گیرائی پر مشتمل ہے۔ اس افسانے میں انسانی شعور، ضمیر کی کشمکش اور موت کی فلسفیانہ تفہیم کو بیان کیا گیا ہے۔ یہ افسانہ نہ صرف انسانی جذبات کے اندرونی تضادات کو عیاں کرتا ہے بلکہ اس کی زبانی بیان کی گئی منطق قاری کو سوچنے پر مجبور کرتی ہے۔ افسانے کا بنیادی سوال ''بوڑھے کا قتل'' اور اس کے جواز پر قائم ہے، لیکن یہ سوال صرف ایک فرد کے فعل کا جائزہ نہیں بلکہ انسانی رویوں، معاشرتی اصولوں اور ضمیر کی پیچیدگیوں کی تفہیم بھی پیش کرتا ہے۔ یہ قتل کو ایک عام مجرمانہ فعل کے بجائے انسانی تجربے کی گہری سطحوں سے جوڑتا ہے، جہاں عمر، تجربہ اور بڑھاپے کے معنی غیر معمولی اہمیت اختیار کرتے ہیں۔ مرکزی کردار کی اندرونی جنگ، قتل کے ارادے اور ضمیر کی مزاحمت کے درمیان، اس افسانے کی روح ہے۔ کردار خود کو مسلسل سوالات کے کٹہرے میں کھڑا کرتا ہے۔ مصنف نے یہ بھی بتانے کی کوشش کہ ہے کہ بڑھاپا محض عمر رسیدگی کا نہیں بلکہ زندگی کی ایک استثنائی حالت کا استعارہ ہے۔ بڑھاپا، موت کو شکست دینے کی مسلسل کوشش ہے۔ اس جدوجہد کو سمجھنے کے لیے وہ حساسیت درکار ہے جو موت کے قریب آنے کا احساس پیدا کرتی ہے۔ یہ افسانہ ان چند لوگوں کی حالت بیان کرتا ہے جنہوں نے موت کو قریب سے محسوس کیا اور اسے شکست دینے کی کوشش کی۔ یہی تجربہ انہیں انسانیت اور زندگی کے اعلیٰ معنی سمجھنے کی صلاحیت دیتا ہے۔ ''بڑھاپا موت کو مسلسل شکست دیے چلے جانے سے طاری ہونے والی تھکان ہے''[۱۶] جیسے جملے افسانے کو فلسفیانہ رنگ دیتے ہیں۔ اس افسانے کی سب سے بڑی خوبی اس کا سوال اٹھانے کا انداز ہے، جو قاری کو محض متن سے آگے جا کر زندگی، موت، اور انسانی شعور پر غور کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ تاہم، یہ گہرائی افسانے کو پیچیدہ بھی بناتی ہے، اور کم حساس یا فلسفیانہ ذہن کے قاری کے لیے بعض اوقات گرفت میں آنا مشکل ہو سکتا ہے۔

ناصر عباس نیر کے افسانہ ''نطشے اور مریل گھوڑا'' ایک گہرے فلسفیانہ اور علامتی تخیل کا شاہکار ہے جو انسانی وجود، یادداشت، اور علم کے باطنی پہلوؤں پر غور و فکر کرتا ہے۔ افسانے میں ایک عام واقعہ، لائبریری جانا، علامتی سطح پر انسانی ذات، علم کی جستجو، اور تخیل کی گہرائیوں کو دریافت کرنے کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ کہانی کا آغاز ایک معمولی تجربے سے ہوتا ہے، لیکن جلد ہی راوی کے مشاہدات اور افکار گہرے معنوی پہلو اختیار کر لیتے ہیں۔ لائبریری کو ایک ایسی جگہ کے طور پر پیش کیا گیا ہے جہاں انسانی شخصیت کی مختلف پرتیں بے نقاب ہوتی ہیں۔ مصنف اس بات پر زور دیتا ہے کہ لائبریری، زندگی کے دیگر مقامات کے برعکس، انسان کی اصل شخصیت کو ظاہر کرتی ہے۔ وہاں، لوگ ان کتابوں کے ذریعے اپنی حقیقت کے آئینے میں جھانکتے ہیں جو ان کے ہاتھوں میں آتی ہیں۔ کتابوں پر کیے گئے بے ساختہ تبصرے انسان کے حقیقی جذبات اور سوچ کی عکاسی کرتے ہیں۔ افسانے کا ایک اور اہم پہلو کتابوں کے ساتھ انسان کا رویہ ہے۔ راوی جب ان کتابوں کی تلاش شروع کرتا ہے جو کبھی کسی نے نہیں پڑھیں، تو یہ رویہ انسانی علم کی ان چھپی ہوئی پرتوں کی نمائندگی کرتا ہے جو عام طور پر نظر انداز ہو جاتی ہیں۔ ان غیر مستعمل کتابوں کی موجودگی، انسان کے اجتماعی لاشعور اور وقت کے دھارے میں علم کے نظر انداز ہونے کا استعارہ بن جاتی ہے۔ کتابوں کی "خاموشی کی قبر" کو کھولنا، راوی کی اس جستجو کو ظاہر کرتا ہے کہ وہ ان تجربات اور حقائق کو دریافت کرے جو عام انسانی توجہ سے محروم رہ گئے ہیں۔

افسانے میں نطشے اور مریل گھوڑے کا ذکر، انسانی ہمدردی اور ظلم کے بیچ ایک گہرے تعلق کی نشاندہی کرتا ہے۔ نطشے کا وہ

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 17. Issue 01, June 2025

تحقیقی وتنقیدی مجلّہ
دریافت

تاریخی لمحہ، جب اس نے گھوڑے کی گردن میں بانہیں ڈال کر اپنی ہمدردی کا اظہار کیا، ایک علامتی واقعہ ہے جو انسانی جذبات کی گہرائیوں کو بیان کرتا ہے۔ راوی جب ماضی کے اس گھوڑے کو موجودہ وقت میں دیکھتا ہے تو وہ حیرت میں ڈوب جاتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود، وہ اس راز میں مداخلت نہیں کرتا جو نطشے اور گھوڑے کے درمیان محفوظ ہے۔ یہ لمحہ حقیقت اور تخیل کے درمیان ایک پل کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے، جہاں تاریخ اور موجودہ وقت آپس میں مدغم ہو جاتے ہیں۔ کہانی کے اختتام پر، جب راوی کو ایک پرانی کتاب میں نطشے کے گھوڑے کی تصویر ملتی ہے، تو یہ ایک علامتی لمحہ بن جاتا ہے۔ یہ تصویر حقیقت اور تخیل کے درمیان تعلق کو ظاہر کرتی ہے، اور اس بات پر زور دیتی ہے کہ تخیل کی دنیا اور مادی حقیقت ایک دوسرے سے جدا نہیں ہیں، بلکہ ایک دوسرے میں شامل ہیں۔ مصنف یہاں اس صورتحال کی عکاسی یوں پیش کرتا ہے:

"میں نے جغرافیے کی ایک کتاب حاصل کی۔ وہ سو برس پہلے لائبریری میں پہنچی تھی۔ اسے سٹاک چیکنگ کے لیے ہاتھ ضرور لگتے رہے تھے، کسی قاری کی نظر اس پر پڑی تھی نہ اس کا لمس اس کی قسمت میں آیا تھا۔ کسی نے اسے مسترد بھی نہیں کیا تھا۔ میں اس کی ورق گردانی کر رہا تھا کہ اس میں سے ایک تصویر گری۔ بلیک اینڈ وائٹ کسی یورپی مصور کی بنائی ہوئی۔ یہ اس گھوڑے کی تصویر تھی، جس کی گردن میں نطشے نے بانہیں حمائل کی تھیں اور جو اس کے آنسوؤں اور سسکیوں کا امانت دار تھا، اور جسے تھوڑی دیر پہلے میں نے باہر دیکھا تھا۔ اس مصور کی تصویر اور میری خیالی تصویر میں فرق تھا۔ یہ فرق کاغذ کے سبب تھا۔ خیالی تصویریں کاغذ تک آتے آتے کچھ بدل جاتی ہیں۔"(۱۷)

ناصر عباس نیر اس افسانے میں انسان کے شعوری اور لاشعوری تجربات کو لائبریری، کتابوں، اور نطشے کے گھوڑے جیسے علامتی عناصر کے ذریعے بیان کرتے ہیں۔ یہ افسانہ قاری کو دعوت دیتا ہے کہ وہ انسانی وجود، ہمدردی، علم اور تخیل کی گہرائیوں میں جھانکے، اور ان سوالات کا سامنا کرے جو بظاہر معمولی نظر آتے ہیں، لیکن حقیقت میں انسانی زندگی کے بڑے فلسفے کو ظاہر کرتے ہیں۔ اسی نوعیت کے منفرد فکری اور فلسفیانہ پہلوؤں لیے مصنف کا ایک اور افسانہ "خواب سگاں" بھی ہے۔ اس افسانے میں ایک مجلس کے دوران کتوں کی عادات و اطوار اور ان کی خصوصیات پر گفتگو کے دوران راوی پر یہ ذمہ داری عائد کی جاتی ہے کہ وہ ملک سراج کے فارم ہاؤس میں موجود نایاب نسل کے کتوں کے ساتھ وقت گزار کر یہ دریافت کرے کہ وہ کیا خواب دیکھتے ہیں۔ اس غیر معمولی مشن کے لیے راوی کے لیے لازم قرار دیا جاتا ہے کہ وہ پہلے اپنے خوابوں سے مکمل طور پر دستبردار ہو۔ طویل جدوجہد کے بعد، وہ اپنے اندر کے خوف پر قابو پاتے ہوئے کتوں سے قربت کا ایک ایسا مرحلہ طے کرتا ہے جو نہ صرف اس کی فکری وسعت کا امتحان ہے بلکہ اس کی جذباتی حدبندیوں کو بھی چیلنج کرتا ہے۔ بالآخر، وہ ان خوابوں کو، جنہیں اس نے سو صفحات پر قلمبند کیا، ملک سراج کے سپرد کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ ملک سراج ایک ایسا پراسرار کردار ہے جسے جاسوس کہا گیا ہے اور جس کے فارم ہاؤس پر بڑے بڑے وزیر اور مشیر بھی حاضر ہوتے ہیں۔

عصر حاضر میں، استعمار زدہ افراد کے خواب اگر ان کی اپنی ملکیت میں رہیں تو وہ انہیں زندگی گزارنے کے متبادل راستے دکھا

سکتے ہیں، یک جہتی حقیقت کے جبر کو توڑ سکتے ہیں اور انہیں تشدد سے نجات دلا سکتے ہیں۔ لیکن یہ آزادی اور تخلیقیت کسی بھی صورت میں مقتدر قوتوں کے مفاد میں نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ "خواب سگاں" کا راوی اپنی تحریر کردہ خوابوں کی نقل کسی قیمت پر حاصل نہیں کر سکتا، کیونکہ یہ خواب ایک استعماری نظام کے خلاف مزاحمت کی علامت بن سکتے ہیں، اور ایسے کسی بھی امکان کو دبانا ہی اس نظام کی بقا کا ضامن ہے۔

ناصر عباس نیر کا افسانہ "ہو سکتا ہے یہ خط آپ کے نام لکھا گیا ہو" بھی اپنی موضوعاتی اور فکری لحاظ سے الگ پہچان رکھتا ہے۔ افسانہ میں ایک خط کے ذریعے قاری کے ساتھ ایسا مکالمہ ترتیب دیا گیا ہے جو نہ صرف ذاتی تجربات کی حدود کو چھوتا ہے بلکہ آفاقی معانی کے دائرے میں بھی قدم رکھتا ہے۔ دراصل خط، جو انسانی جذبات کے اظہار کا قدیم ترین وسیلہ ہے، لیکن یہاں وقت و مکان کی قیود سے آزاد ہو کر معنی کے نئے جہان تخلیق کرتا ہے۔ افسانے کی ساخت اپنی نوعیت میں بالکل منفرد اور تازگی سے بھرپور ہے۔ کہانی کا آغاز کتابوں کی محبت اور پرانی اشیاء کی یادوں کے ہلکے پھلکے جذبات سے ہوتا ہے، جو قاری کو ایک نرم، مانوس فضا میں لے آتا ہے۔ لیکن جیسے ہی خط کی پرتیں کھلتی ہیں، کہانی قاری کو سماجی تاریکی اور انسانیت کے پوشیدہ زخموں کی طرف لے جاتی ہے۔ یہ انکشاف افسانے کو ایک چونکا دینے والے موضوع کی جانب موڑ دیتا ہے، جہاں سماج کی منافقت، ظلم اور جبر کی پرتیں کھل کر سامنے آتی ہیں۔

ناصر عباس اس افسانے میں جرم کی جڑوں تک پہنچنے کی ضرورت پر زور دیتے ہیں۔ یہ بتاتے ہیں کہ صرف سزا دینا انسانی جبلتوں کو قابو میں لانے کا حل نہیں ہے۔ عصمت دری جیسے حساس اور تکلیف دہ مسئلے کو سماجی رویوں اور حکومتی ناکامیوں کے آئینے میں دکھایا ہے۔ مصنف کے نزدیک محض سزا سے جرم دبایا نہیں جا سکتا، کیونکہ انسانی فطرت عبرت سے زیادہ نقل پر مائل ہوتی ہے۔

کہانی میں خواجہ سرا کا کردار بطور علامت سامنے آتا ہے۔ جو انسانی تجسس، جنسی جبلت اور سماجی منافقت کے پیچیدہ دھاگوں کو عیاں کرتا ہے۔ خواجہ سرا کی برہنگی ایک ایسا منظر تخلیق کرتی ہے جو معاشرتی اقدار اور جبلتوں کے تضاد کو بے نقاب کرتا ہے۔ یہ کردار معاشرتی رویوں اور جنسی استحصال پر ایک گہرا سوالیہ نشان بن کر ابھرتا ہے، جو قارئین کو انسانی نفسیات کے تاریک گوشوں پر غور کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ افسانے کی سب سے بڑی خوبی اس کا فکری اور علامتی اسلوب ہے۔ مصنف نے خواجہ سرا کے کردار کے ذریعے جنسیت اور جنسی استحصال کے گرد بنی سماجی منافقت کو عریاں کر دیا ہے۔ افسانے کا وہ منظر جہاں انسانی مجمع درحقیقت درندوں کی صورت اختیار کر لیتا ہے، انسانی فطرت کے تاریک ترین گوشوں کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔ اس افسانے کے اختتام پر ایک تلخ حقیقت کو اجاگر کیا گیا ہے، جو ہمیں ہمارے معاشرتی رویوں، قانونی نظام اور انسانی جبلتوں کے خلاف آئینہ دکھاتا ہے۔

ناصر عباس نیر نے باقی کئی موضوعات اور افکار کی طرح متصوفانہ رنگ افسانہ "تیسرا دروازہ" میں پیش کیا ہے۔ اس افسانہ میں انسانی زندگی کے فلسفیانہ اور روحانی پہلوؤں کو علامتی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ کہانی بظاہر جنت اور جہنم کے دروازوں پر مرکوز ہے، لیکن اس کے پس پردہ انسانی نفسیات، روحانی سفر اور حقیقت کی تلاش کے موضوعات پوشیدہ ہیں۔ افسانے میں تیسرا دروازہ ایک علامت ہے جو روایتی جنت اور جہنم کے بیانیوں سے ماورا ایک نئی سوچ یا نئی حقیقت کی نمائندگی کرتا ہے۔ یہ دروازہ انسان کی اپنی ذات کی گہرائیوں اور ان دیکھے امکانات کی طرف اشارہ کرتا ہے، جو کہ عمومی سماجی یا مذہبی بیانیے میں نمایاں نہیں ہوتے۔ جنت اور جہنم کے

دروازے اس دنیا کی روایتی خواہشات اور خوف کی علامت ہیں، جہاں انسان اپنی زندگی کو یا تو انعام کے حصول یا سزا کے خوف میں بسر کرتا ہے۔ لیکن تیسرا دروازہ ان دونوں سے آگے کا راستہ دکھاتا ہے، جہاں مقصد صرف جیت یا ہار نہیں، بلکہ خود شناسی اور معنویت کی تلاش ہے۔ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

> "میں نے ایک بار جنت کے دروازے سے گزرنے کی جاں توڑ کوشش کی تھی، مگر وہ دھکم پیل تھی کہ پسلی تڑوا کر واپس آ گیا۔ یہاں جس کو دیکھو، اس ایک دروازے سے گزرنا چاہتا ہے۔ جانتے ہو، کیوں؟ نہیں۔ اس لیے کہ یہ سب جنت حاصل کرنا نہیں چاہتے، مقابلہ جیتنا چاہتے ہیں۔ دھکم پیل مقابلے کے سوا کہاں ہوتی ہے؟ خیر، کیا تم نے کسی کو جہنم کے دروازے سے گزرتے دیکھا ہے؟ نہیں۔۔۔۔ تم جس تیسرے دروازے کی بات کر رہے تھے، وہ کب کھلے گا اور کہاں؟ اس نے سوال دہرایا۔ جب یہ دونوں دروازے بند ہو جائیں گے تو تیسرا دروازہ کھلے گا۔ یہ بند کیسے ہوں گے؟ اس نے ایک نیا سوال کیا۔ جب تک تیسرا دروازہ نہیں کھلتا، یہ بند نہیں ہوں گے۔"(۱۸)

افسانے میں دھکم پیل اور جنت کے دروازے سے گزرنے کی کوشش انسانی معاشرت کی ان کمزوریوں کو ظاہر کرتی ہے، جہاں لوگ مقصد کو سمجھنے کے بجائے محض مقابلہ بازی اور برتری کے حصول میں لگے رہتے ہیں۔ یہی کشمکش، معاشرتی دھارے میں انسان کی روحانی ترقی کو روک دیتی ہے۔ دوسری طرف، جہنم کے دروازے کے ذکر سے ظاہر ہوتا ہے کہ انسان اپنی ناواقفیت میں ہی اپنے ساتھ اپنی ناکامیوں اور مایوسیوں کا بوجھ لادتا ہے۔ تیسرے دروازے کا تصور، جو ان دونوں دروازوں کے بند ہونے کے بعد کھلے گا، اس بات کی علامت ہے کہ جب تک انسان ان عمومی خواہشات اور خوف سے آزاد نہیں ہوتا، اسے نئی حقیقت اور آزادی تک رسائی حاصل نہیں ہو سکتی۔ یہ دروازہ ایک نئے نقطہ نظر، ایک نئی سوچ، اور ایک نئی زندگی کی علامت ہے جو انسان کی داخلی تلاش سے ممکن ہوتی ہے۔ ناصر عباس نیر نے اس افسانے میں علامتوں اور استعاروں کے ذریعے ایک گہرا فلسفیانہ پیغام پیش کیا ہے۔ کہانی کا مرکزی کردار ایک غیر روایتی سوچ کی نمائندگی کرتا ہے جو سماجی اور مذہبی بیانیوں سے بالاتر ہو کر انسانی خود شناسی اور روحانی ترقی کی جانب اشارہ کرتا ہے۔

ناصر عباس نیر کے چوتھے افسانوں کے مجموعے "راکھ سے لکھی گئی کتاب" میں شامل افسانہ "موت کاروبار ہے" میں انسانی زندگی کی بے قدری، معاشرتی بے حسی اور سرمایہ دارانہ نظام کی اخلاقی گراوٹ کو بڑی شدت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ افسانہ میں ایک ایسے سماجی ماحول کی عکاسی کی گئی ہے جہاں انسانی المیوں کو صرف اعداد و شمار کی شکل میں دیکھا جاتا ہے۔ بم دھماکوں کے نتیجے میں مرنے والوں کی تعداد، ان کے نام و نشان کی گمشدگی، اور سرد خانے میں رکھی لاشوں کی بے توقیری معاشرتی بے حسی کو نمایاں کرتی ہے۔ یہ رویے نہ صرف انسانی جذبات کی موت کی علامت ہیں بلکہ یہ اس بات کا ثبوت بھی ہیں کہ کس طرح جدید دنیا میں موت بھی کاروبار بن چکی ہے۔

افسانے کا ایک اہم موضوع سرمایہ دارانہ نظام پر تنقید ہے۔ جہاں موت کو بھی ایک کاروبار کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ کہانی

میں لاشوں کے ساتھ روا رکھا جانے والا بے حسی پر مبنی رویہ، دھماکوں سے فائدہ اٹھانے والوں کا ذکر، اور میڈیا کی دلچسپی کا صرف تشہیری مقاصد تک محدود رہنا اس بات کو اجاگر کرتے ہیں کہ معاشرہ اخلاقی دیوالیہ پن کی کس حد تک پہنچ چکا ہے۔ میڈیا، جو عوام کی آواز بننے کا دعویٰ کرتا ہے، نہ حقائق کو سامنے لانے کی جرات کرتا ہے اور نہ ہی مظلوموں کی دادرسی میں دلچسپی رکھتا ہے۔ اس کا مقصد محض لاشوں کو استعمال کرتے ہوئے اپنے تجارتی مفادات حاصل کرنا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام نے انسانی معاشرت کو نہ صرف اخلاقی زوال کی گہرائیوں میں دھکیل دیا ہے بلکہ انسانیت کے جذبات کو بھی ماند کر دیا ہے۔ لالچ، طمع، اور حرص نے انسانوں کو اس قدر بے حس بنا دیا ہے کہ دولت کمانے کی دوڑ میں وہ انسانیت کے بنیادی اصولوں کو روندنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ افسانے کا اختتام صحافی کے لیے ایک دھمکی اور اس کے فولڈر میں محفوظ کہانی کے ساتھ ہوتا ہے۔ جو اس بات کی علامت ہے کہ سچائی کو سامنے لانے والے خود خطرے میں ہیں۔ یہ حصہ اس خوفناک حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ جو لوگ موت کے کاروبار کو بے نقاب کرنا چاہتے ہیں۔ انہیں بھی خاموش کر دیا جاتا ہے۔ یہاں صحافت بھی قید میں دکھائی گئی ہے۔ اس صورت حال کو مصنف نے افسانے کے اختتام میں یوں پیش کیا ہے:

> "بی بی! پہلی بات: سٹوری کرنا آپ کے بس کا روگ نہیں۔ بہتر ہے آپ رسالوں کے لیے کہانیاں لکھا کریں۔ دوسری بات: تمھاری سٹوری کا آخری حصہ اگرچہ کل کی لیڈ بن سکتا ہے، مگر ہمیں اپنا اخبار اور جان دونوں عزیز ہیں. ایڈیٹر کا جواب کچھ زیادہ توقع کے خلاف نہیں تھا۔ اس نے چپ چاپ یہ سٹوری اس فولڈر میں منتقل کر دی، جسے اس جیسی کہانیوں کے لیے اس نے بنا رکھا تھا۔ لیپ ٹاپ بند کرتے ہوئے اسے خیال آیا کہیں یہ فولڈر بھی فراموشی کا غار نہ ثابت ہو!"[۱۹]

یہ افسانہ نہ صرف انسانی زندگی کے فلسفے اور موت کی حقیقت کو اجاگر کرتا ہے بلکہ قارئین کو ان کے رویوں اور معاشرتی اقدار پر غور کرنے کی دعوت بھی دیتا ہے۔ یہ ایک تلخ مگر حقیقی بیانیے پر مبنی کہانی ہے جو انسانی جذبات، اخلاقی زوال، اور سرمایہ دارانہ نظام کی پیچیدگیوں پر شدید تنقید کرتی ہے۔

ناصر عباس نیر اپنے افسانوں میں مختلف موضوعات، افکار اور نظریات کی گہری آمیزش پیش کرتے ہیں۔ ایسا ہی ان کا ایک افسانہ "دریا، بستی اور قانون کی کتاب" ان کے افسانوں کے پانچویں مجموعے "جب تک ہے زمین" میں شامل ہے۔ اس افسانے میں انسانی زندگی، قوانین اور ان کے اخلاقی و وجودی پہلوؤں پر سوالات اٹھائے گئے ہے۔ کہانی مختلف علامتوں کے ذریعے انسانی شعور، اختیار اور تقدیر کے معاملات کو واضح کرتی ہے۔ دریا کو زندگی کی علامت کے طور پر پیش کیا گیا ہے، جو مسلسل حرکت میں ہے، مگر کچھ مقامات پر ایسا لگتا ہے جیسے رک کر کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا ہو۔ دریا کی وسعت اور پیچیدگی انسانی زندگی کے لاتعداد پہلوؤں کی نمائندگی کرتی دکھائی دیتی ہے۔ افسانے میں کشتی کو ایک عبوری مرحلے یا انسانی شعور کی سطح پر تبدیلی کے طور پر پیش کی گئی ہے۔ یہ انسان کے سفر، اس کی بے یقینی اور اس کی روحانی تلاش کی نمائندگی کرتی ہے۔ کشتی کا اچانک غائب ہونا اس بات کی علامت ہے کہ حقیقت اور خیال کے درمیان سرحد دھندلی ہے۔ قانون کی کتاب ایک طاقتور علامت ہے جو انسان کے بنائے ہوئے اور غیر مرئی قوانین کے درمیان فرق کو نمایاں کرتی ہے۔ یہ کتاب ایک ایسا ماخذ ہے جو ہر فرد کو معلوم نہیں، لیکن ہر شخص کو اس کی اطاعت کرنی پڑتی ہے۔ مصنف اس علامت کے

ذریعے انسانی قوانین کی غیر منطقی فطرت اور ان کے اطلاق پر سوال اٹھاتا ہے۔ ملاح ایک خاموش نگران کے طور پر ظاہر ہوتا ہے، جو دریا کے ذریعے انسانی سفر کی نگرانی کرتا ہے لیکن گفتگو نہیں کرتا۔ یہ کردار ایک رہنما کی نمائندگی کرتا ہے جو انسان کو راستہ دکھاتا ہے مگر اس کی وضاحت نہیں کرتا۔ قانون کا نگہبان اس بات کی علامت ہے کہ قانون ایک غیر مرئی طاقت ہے، جو ہمیشہ موجود رہتی ہے اور صرف ضرورت پڑنے پر ظاہر ہوتی ہے۔ عدالت کا جج انصاف کے نام پر بے رحمی کی نمائندگی کرتا ہے، جہاں انسانی دلائل کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ افسانے میں مصنف اس حقیقت کو اجاگر کرتے ہیں کہ زندگی قوانین، ضوابط، اور انسان کے اپنے فیصلوں کا ایک پیچیدہ جال ہے۔ ان قوانین کا علم ہونا یا نہ ہونا، دونوں صورتوں میں انسان ان کے اثرات سے بچ نہیں سکتا۔ افسانہ قاری کو ایک گہرے فکری تجربے میں مبتلا کرتا ہے، جہاں وہ زندگی، قوانین، اور ان کی معنویت پر غور کرتا ہے۔ یہ کہانی ایک خوبصورت فلسفیانہ سفر ہے، جو قاری کو اپنے وجود کے معنی تلاش کرنے کی ترغیب دیتی ہے۔

ناصر عباس نیر کے افسانے ان منطقوں میں قدم رکھتے ہیں جہاں مابعد نو آبادیاتی باشندوں کی رسائی یا تو ممکن ہی نہیں ہوتی، یا اگر ممکن ہو بھی تو ان منطقوں کی حقیقت کو سمجھنے اور اس پر غور کرنے کا حوصلہ اکثر مفقود ہوتا ہے۔ ان کے افسانے، ”اپنے ماضی کے خدا“، خرخشاں نمود“، ”ملبے کا بزنس“، ”پہلے کھیلی اور بعد میں لکھی گئی تمثیل“، ”لوگو فوبیا“، ”خاموشی کا سر“ وغیرہ ایک ایسے ہی فکری اور تخلیقی کینوس کی تشکیل کرتے ہیں جہاں قاری کو غیر محسوس انداز میں ایک گہرے مکالمے میں شامل کر لیا جاتا ہے۔ ان کے افسانے صرف ایک بیانیہ کے ظاہری پہلوؤں تک محدود نہیں رہتے بلکہ ان کی تہہ میں پوشیدہ اور پیچیدہ سوالات کو بھی چھیڑتے ہیں، جن پر عام طور پر بات کرنا بھی مشکل محسوس ہوتا ہے۔ بسا اوقات کہانی میں ایسا ہوتا ہے کہ ایک بیان کنندہ کی بات کو کوئی دوسرا کردار کسی نئے زاویے اور مختلف معنی کے ساتھ دہراتا ہے۔ بعض مواقع پر یوں محسوس ہوتا ہے کہ کہانی میں بیان کنندہ تو صرف ایک ہی ہے، لیکن وہ کسی حتمی بات یا قطعی نتیجے تک پہنچنے سے گریز کرتا ہے۔ وہ کہانی کو اس طرح تشکیل دیتا ہے کہ معنی ایک مسلسل التوا میں رہتا ہے، قاری کو یہ آزادی ملتی ہے کہ وہ اپنی تفہیم کے مطابق کہانی کے مختلف پہلوؤں کو کھوجتا رہے۔ یہ عدم قطعیت مصنف کے افسانوی فن کا خاصہ ہے۔

ان کے افسانوی اسلوب کی یہ خاصیت نہ صرف قاری کو موجودہ سماجی اور سیاسی نظام کے غیر محسوس جبر کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے بلکہ ان جابرانہ بیانیوں کے مقابل متبادل بیانیے تخلیق کرنے کے لیے بھی راہ ہموار کرتی ہے۔ ان کا بیانیہ ایک ایسے فکری مکالمے کی بنیاد رکھتا ہے جو نہ صرف انسانی شعور کو نئے امکانات سے روشناس کراتا ہے بلکہ قاری کو اس قابل بھی بناتا ہے کہ وہ اپنی ذات، اپنے معاشرے اور اپنے گرد و پیش کے ماحول اور نظام سے تجزیہ کر سکے۔ وہ علامتوں، استعاروں اور تجریدی زبان کے استعمال سے کہانیوں کو نہ صرف گہرائی بلکہ ایک نئے معنوی تجربے سے آراستہ کرتے ہیں۔ ناصر عباس نیر ماضی، حال اور مستقبل کی ان پیچیدہ حقیقتوں کو بے نقاب کرتے ہیں، جن کے ذریعے انسانی شخصیت کی تشکیل میں مختلف عوامل اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔ ان کے افسانے ہمیں اس بات کا شعور دیتے ہیں کہ انسان نہ صرف اپنے داخلی مسائل کا مجموعہ ہے بلکہ وہ سماجی، سیاسی، اور ثقافتی اثرات کے نتیجے میں بھی اپنی شناخت تشکیل دیتا ہے۔

ناصر عباس نیر کے افسانوں کی خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان کے کئی جملے ایک شعر کی طرح ایک مکمل موضوع رکھتے ہیں، اور

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 17. Issue 01, June 2025

اگلے جملے میں ایک نیا موضوع سامنے آ جاتا ہے۔ ان کے افسانوں میں کئی واقعات اور موضوعات شامل ہوتے ہیں، جن میں ہر واقعہ اپنی جگہ پر ایک مکمل کہانی کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ واقعات بظاہر الگ الگ محسوس ہوتے ہیں لیکن افسانے کی مجموعی بنت میں گہری ہم آہنگی کے ساتھ جڑے ہوتے ہیں، یوں وہ کہانی کا حصہ بن جاتے ہیں۔ ناصر عباس نیر کا اسلوب ایک افسانے میں محض ایک کہانی سنانے تک محدود نہیں رہتا، بلکہ وہ ایک کہانی کے اندر کئی چھوٹی کہانیاں بیان کرتے ہیں۔ یہ کہانیاں نہ صرف ایک دوسرے سے مربوط ہوتی ہیں بلکہ بنیادی کہانی کا اہم جزو بھی بن جاتی ہیں۔ ان کا یہ انداز افسانے کے کسی ایک مرکزی نکتے کے تصور کو چیلنج کرتا ہے۔ اگر ایک افسانے میں ایک ہی بیان کنندہ ہو، تو وہ بھی ایک واقعے کو مختلف زاویوں سے دیکھنے اور بیان کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ ناصر عباس نیر خوابوں، واہموں، توہمات اور اساطیری قصوں کو اپنے افسانوں میں اس مہارت سے شامل کرتے ہیں کہ وہ حقیقت نگاری کے روایتی تصور کو نئے معنوں میں پیش کرتے ہیں۔ ان کا اسلوب حقیقت اور تخیل کے درمیان ایک پل تعمیر کرتا ہے، جس کے ذریعے سے وہ کہانی کی گہرائی اور پیچیدگی کو مزید اجاگر کرتے ہیں۔

ناصر عباس نیر کے افسانوں کی تخلیق میں جو خیالات اختیار کیے ہیں، وہ عموماً ان کے ذاتی تجربات اور اپنے ماحول سے اخذ شدہ ہیں۔ انہوں نے پنجاب کی لوک حکمت، اس کے مروجہ افکار، اور پنجابی اصطلاحات کو جس مہارت سے اپنے افسانوں میں استعمال کیا ہے، وہ قابلِ ستائش ہے۔ یہی وہ عنصر ہے جس کی بدولت یہ افسانے پڑھتے وقت قاری میں ایک گہری اپنائیت اور ہم آہنگی کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ ایسی تحریر، جو قاری کو ان گہرے رازوں سے آشنا کرے جو وہ کسی سے بھی آگے نہیں جاہتا، درحقیقت ایک عظیم اور شاندار تحریر ہوتی ہے، اور یہی ادب کا حقیقی مقصد ہے جسے یہ تحریر سچ میں پورا کرتی ہے۔ یہ افسانے نہ صرف زبان اور اس کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہیں بلکہ اس بات کو بھی اجاگر کرتے ہیں کہ لفظ کی حقیقت اور بول چال کی قوت کس طرح ایک نئی جہت فراہم کرتی ہے۔ اردو ادب میں اس نوعیت کی تخلیقی مثالیں کم ہی ملتی ہیں۔ ان افسانوں کا مطالعہ کرنے کے بعد قاری حقیقتاً اس قابل ہو جاتا ہے کہ وہ نہ صرف افسانہ پڑھنے کا مزہ لے بلکہ اسے مکمل طور پر سمجھ بھی سکے۔ یہ افسانے دراصل اس فرق کو واضح کرنے میں کامیاب ہیں جو افسانے اور کہانی کے درمیان موجود ہوتا ہے، حالانکہ یہ فرق کئی عالم و فاضل افراد نے اپنی تنقیدی تحریروں میں بیان کیا ہے، لیکن ان کی پیچیدگیوں کی وجہ سے عام قاری تک اس کا مفہوم نہیں پہنچ پاتا۔ اس کے برعکس، ان افسانوں کو پڑھ کر قاری خود بخود اس فرق کو سمجھنے لگتا ہے اور اس کی حقیقت کو تسلیم کرتا ہے۔

ناصر عباس نیر کے افسانے محض کہانیاں نہیں بلکہ ایک فکری و شعوری تجربہ ہیں، جو قاری کو بیانیے کی طاقت اور اس کے ممکنہ نتائج کے حوالے سے نئے سرے سے سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔ ان کی یہ تکنیک ادب کے وسیلے سے انسانی ذہن کو آزادی کے نئے راستے دکھاتی ہے اور معنی کی تکثیریت کو تسلیم کرتے ہوئے استبدادی اور استعماری بیانیوں کے مقابل ایک مضبوط فکری مزاحمت قائم کرتی ہے۔ ان کی تحریریں زندگی کے مختلف پہلوؤں، انسانی نفسیات، اور معاشرتی حقیقتوں کی عکاسی کرتی ہیں۔ ان کے افسانے سماجی، سیاسی، اور تہذیبی مسائل کو نمایاں کرتے ہوئے طبقاتی تفریق، سماجی ظلم و ستم، اور ثقافتی زوال جیسے موضوعات پر روشنی ڈالتے ہیں۔ وہ انسانی احساسات، تنہائی اور جذباتی کشمکش کو گہرے فلسفیانہ انداز میں پیش کرتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں مابعد نو آبادیاتی شعور کی جھلک

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 17. Issue 01, June 2025

ملتی ہے، جہاں شناخت کے بحران اور استحصال جیسے مسائل کو بیان کیا گیا ہے۔ وجودیت کے فلسفے کے تحت وہ زندگی کے بے معنی پہلوؤں پر سوال اٹھاتے ہیں اور اپنے کرداروں کی کہانیوں کے ذریعے وجود کی تلاش کا بیان کرتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں مروجہ روایات اور بیانیوں کو چیلنج کرنے کی جھلک بھی نمایاں ہے بلکہ وہ ایک نیا بیانیہ بھی تخلیق کرتے ہیں، جو ان کی ساخت شکن سوچ کی عکاسی کرتی ہے۔
ناصر عباس نیر افسانوں میں بین المتونیت کی تکنیک کے ذریعے ایک منفرد رجحان پیش کرتے ہیں۔ ان کی افسانوی تحریریں مختلف متون کے درمیان تعلقات کو دریافت کرنے اور عصری مسائل پر غور و فکر کا موقع فراہم کرتی ہیں۔ ان کے افسانے جمالیاتی حسن اور فکری گہرائی کا امتزاج ہیں، جہاں ابہام اور لایعینت قاری کو متن کے معانی تلاش کرنے کی منفرد جدوجہد میں شامل کرتے ہیں۔ ان کے افسانے قارئین کو محض تفریح فراہم کرنے کے بجائے سوچنے پر مجبور کرتے ہیں اور انہیں زندگی کے پیچیدہ سوالات سے روشناس کراتے ہیں۔ اس طرح، ناصر عباس نیر کے افسانے اردو ادب میں فکری تحریک اور موضوعاتی تخلیقی اظہار کا ایک شاندار امتزاج پیش کرتے ہیں۔

حواشی وحوالہ جات

۱۔ ناصر عباس نیر، پرانااور نیانظام انصاف، مشمولہ: راکھ سے لکھی گئی کتاب، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۲۳ء، ص ۳۲
۲۔ ناصر عباس نیر، لکھنا بھی سزا ہے، پر آدمی ہونا بڑی سزا ہے، مشمولہ: راکھ سے لکھی گئی کتاب، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۲۳ء، ص ۶۶
۳۔ ناصر عباس نیر، پروشاسی، کروفر، فروشاسی، مشمولہ: جب تک ہے زمین، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۲۵ء، ص ۴۵
۴۔ سہیل احمد خان، ڈاکٹر، سلیم الرحمان، مرتبہ: منتخب ادبی اصطلاحات، جی سی یونیورسٹی، لاہور، ۲۰۰۵ء ص ۱۲۱
۵۔ ناصر عباس نیر، تمہارا قانون، مشمولہ: ایک زمانہ ختم ہوا ہے، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۲۰ء، ص ۱۶
۶۔ ناصر عباس نیر، گڑ اور گولیاں، مشمولہ: جب تک ہے زمین، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۲۵ء، ص ۱۴۸
۷۔ ناصر عباس نیر، عورت کو زیادہ محبت کس سے ہے؟ مشمولہ: راکھ سے لکھی گئی کتاب، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۲۳ء، ص ۲۲
۸۔ ناصر عباس نیر، ولدیت کا خانہ، مشمولہ: خاک کی مہک، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۶ء، ص ۵۷
۹۔ ناصر عباس نیر، درخت باتیں ہی نہیں کرتے۔۔۔۔۔، مشمولہ: راکھ سے لکھی گئی کتاب، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۲۳ء، ص ۱۰
۱۰۔ ناصر عباس نیر، کفارہ، مشمولہ: خاک کی مہک، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۶ء، ص ۴۱
۱۱۔ ایضاً، ص ۴۷
۱۲۔ ناصر عباس نیر، یاد اور بھول کا کھیل، مشمولہ: ایک زمانہ ختم ہوا ہے، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۲۰ء، ص ۱۴۶
۱۳۔ ناصر عباس نیر، آوازیں اور سایہ، مشمولہ: جب تک ہے زمین، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۲۵ء، ص ۱۱۴
۱۴۔ ناصر عباس نیر، کھنڈر کی تختی، مشمولہ: فرشتہ نہیں آیا، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۷ء، ص ۱۵۹
۱۵۔ ناصر عباس نیر، اسے کسی عورت نے جنم نہیں دیا، مشمولہ: ایک زمانہ ختم ہوا، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۲۰ء، ص ۱۰۸

۱۶۔ ناصر عباس نیر، بوڑھے کا قتل، مشمولہ: راکھ سے لکھی گئی کتاب، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۲۳ء، ص۱۳۶

۱۷۔ ناصر عباس نیر، نطشے اور مریل گھوڑا، مشمولہ: جب تک ہے زمین، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۲۵ء، ص۱۳۶

۱۸۔ ناصر عباس نیر، تیسرا دروازہ، مشمولہ: فرشتہ نہیں آیا، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۷ء، ص۱۶۶

۱۹۔ ناصر عباس نیر، موت کاروبار ہے، مشمولہ: راکھ سے لکھی گئی کتاب، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۲۳ء، ص۱۱۵

References in Roman Script:

1. Nasir Abbas Nayyar, *Purana Aur Naya Nizaam-e-Insaaf*, Mashmoola: *Raakh Se Likhi Gayi Kitaab*, Sang-e-Meel Publications, Lahore, 2023, p.32
2. Nasir Abbas Nayyar, *Likhna Bhi Saza Hai, Par Aadmi Hona Bari Saza Hai*, Mashmoola: *Raakh Se Likhi Gayi Kitaab*, Sang-e-Meel Publications, Lahore, 2023, p.66
3. Nasir Abbas Nayyar, *Paroshasi, Karofur, Faroshahi*, Mashmoola: *Jab Tak Hai Zameen*, Sang-e-Meel Publications, Lahore, 2025, p.45
4. Mualifeen: Sohail Ahmad Khan, Dr. Saleem Rehman, *Muntakhab Adabi Istilahaat*, GC University, Lahore, 2005, p.121
5. Nasir Abbas Nayyar, *Tumhara Qanoon*, Mashmoola: *Ek Zamana Khatam Hua Hai*, Sang-e-Meel Publications, Lahore, 2020, p.16
6. Nasir Abbas Nayyar, *Gur Aur Goliyan*, Mashmoola: *Jab Tak Hai Zameen*, Sang-e-Meel Publications, Lahore, 2025, p.148
7. Nasir Abbas Nayyar, *Aurat Ko Zyada Mohabbat Kis Se Hai?*, Mashmoola: *Raakh Se Likhi Gayi Kitaab*, Sang-e-Meel Publications, Lahore, 2023, p.22
8. Nasir Abbas Nayyar, *Walidiyat Ka Khana*, Mashmoola: *Khaak Ki Mehak*, Sang-e-Meel Publications, Lahore, 2016, p.57
9. Nasir Abbas Nayyar, *Darakht Baatain Hi Nahi Karte...*, Mashmoola: *Raakh Se Likhi Gayi Kitaab*, Sang-e-Meel Publications, Lahore, 2023, p.10
10. Nasir Abbas Nayyar, *Kaffara*, Mashmoola: *Khaak Ki Mehak*, Sang-e-Meel Publications, Lahore, 2016, p.41
11. Aizan, p.47
12. Nasir Abbas Nayyar, *Yaad Aur Bhool Ka Khel*, Mashmoola: *Ek Zamana Khatam Hua Hai*, Sang-e-Meel Publications, Lahore, 2020, p.146
13. Nasir Abbas Nayyar, *Aawazain Aur Saya*, Mashmoola: *Jab Tak Hai Zameen*, Sang-e-Meel Publications, Lahore, 2025, p.114
14. Nasir Abbas Nayyar, *Khandar Ki Takhti*, Mashmoola: *Farishta Nahi Aya*, Sang-e-Meel Publications, Lahore, 2017, p.159
15. Nasir Abbas Nayyar, *Usay Kisi Aurat Ne Janam Nahi Diya*, Mashmoola: *Ek Zamana Khatam Hua*, Sang-e-Meel Publications, Lahore, 2020, p.108
16. Nasir Abbas Nayyar, *Boorhay Ka Qatal*, Mashmoola: *Raakh Se Likhi Gayi Kitaab*, Sang-e-Meel Publications, Lahore, 2023, p.136
17. Nasir Abbas Nayyar, *Nietzsche Aur Maryal Ghoda*, Mashmoola: *Jab Tak Hai Zameen*, Sang-e-Meel Publications, Lahore, 2025, p.136

18. Nasir Abbas Nayyar, *Teesra Darwaza*, Mashmoola: *Farishta Nahi Aya*, Sang-e-Meel Publications, Lahore, 2017, p.166
19. Nasir Abbas Nayyar, *Maut Karobar Hai*, Mashmoola: *Raakh Se Likhi Gayi Kitaab*, Sang-e-Meel Publications, Lahore, 2023, p.115

Mr. Munir Abbas is currently pursuing his PhD in the Department of Urdu at Minhaj University, Lahore, Pakistan. He is the author of one book and has published eight research articles. He holds an MPhil degree in Urdu Literature from the University of Southern Punjab, Multan, where he secured first position in his studies.

Dr. Munawar Amin serves as an Assistant Professor in the Department of Urdu at the University of Southern Punjab, Multan, Pakistan. She obtained her PhD from Government College University, Lahore, with a specialization in Urdu fiction and research editing. Dr.Amin is the author of one book and has published twenty research articles.